اسلامی عہد میں فنِ تعمیر

(ہند پاکستان)

از

ڈاکٹر سیّد معین الحق

دائرہ معین المعارف

حق نشان، ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵

۱۹۶۵

اسلامی عہد میں فنِ تعمیر
(ہند پاکستان)

از

ڈاکٹر سیّد معین الحق

دائرہ معین المعارف

حق نشان ؛ ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵

۱۹۶۵

قیمت چھہ روپیہ

انتساب

الحاج خان بہادر مولوی ظفر حسن او، بی، ای

(۱۸۸۶—۱۹۶۵)

کے نام

جنہوں نے غیر منقسم ہندوستان میں بحیثیت ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ، اسلامی فن تعمیر اور عمارات کا محققانہ مطالعہ کیا اور اس موضوع پر گرانقدر تصنیفات یادگار چھوڑیں —

سید معین الحق

اسلامی عہد میں فن تعمیر
(ہند پاکستان)

از

ڈاکٹر سیّد معین الحق

فہرستِ مضامین

تقریب

تہذیب و تمدن کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس نے برصغیر کی تاریخ کے اسلامی عہد میں نمایاں ترقی نہ کی ہو، نظم حکومت، سیاست و سپہگری، غذا و لباس، تعمیر و تزئین، خطاطی و مصوری اور فنون کے علاوہ خود طرز رہائش اور آداب معاشرت، غرض زندگی کے کسی پہلو پر بھی نظر ڈالئے، آپ کو اسلامی رنگ غالب نظر آئے گا، مذہب و روحانیت کے تصورات اور علم و ادب کی مختلف شاخوں کا بغور مطالعہ کیجئے، آپ دیکھیں گے کہ اسلامی روایات کے اثرات نے ہی مستقل حیثیت اختیار کرلی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ برصغیر کا قدیم تمدن ترقی یافتہ نہ تھا، اور مسلمان ایک ایسے علاقے میں آئے تھے جس کو اس دور کے لحاظ سے پسماندہ کہا جاسکتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی قدیم آبادی نے زندگی کے بعض شعبوں میں کافی ترقی کی تھی، فنون میں تعمیر کے علاوہ نقاشی اور سنگتراشی میں یہاں کا معیار بہت بلند تھا۔ ادب، فلسفہ، ہیئت، فلکیات اور مذہب میں بھی ہند پاکستانی تصورات بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے تھے، غرضکہ برصغیر قدیم تہذیبوں میں سے ایک بڑی تہذیب کا مسکن تھا۔ یہی سبب تھا کہ اسلام کو ملکی و تہذیبی فتوحات کی تکمیل کے

لئے ایک طویل سفر طے کرنا پڑا، دوسرے علاقوں، مثلاً مصر و ایران کی سلطنتیں چند سالوں میں فتح ہو گئیں اور وہاں تہذیب و تمدن کے نقشے بہت جلد بدل گئے، یہاں کا نقشہ اس سے مختلف ہے۔

بہر حال برصغیر کے وسیع علاقوں کو زیر نگیں لانے اور یہاں کی تہذیب و تمدن کو نیا لباس پہنا کر بام ترقی تک پہنچانے میں جتنا بھی وقت لگا ہو اس میں شک نہیں کہ اسلام کے اثر سے یہاں کی زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، وہ بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، تاریخ نے مسلمانوں کے ان کارناموں کا صحیح جائزہ نہیں لیا ہے، خود مسلمان مورّخ اس معاملہ میں مورد الزام ہیں، انہوں نے حکمرانوں کے حربی کارناموں کے مقابلہ میں دوسرے مسائل کو زیادہ اہمیت نہ دی ہم کو اس دور کی تاریخی تصانیف میں فتوحات کے ذکر میں ہزارہا صفحات ملیں گے، لیکن تہذیب و تمدن کی عمارت کو منزل تکمیل تک پہنچانے اور اس کے مختلف گوشوں کو مستحکم و مزین کرنے میں جو کوششیں کی جاتی رہیں، ان کا ذکر نہایت مختصر اور ناکافی ہے، اور اکثر ضمنی طور پر کیا گیا ہے، صرف آئین اکبری ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہم کو ان مسائل سے متعلق مفید معلومات ملتی ہیں لیکن اس کے مصنف کی توجہ صرف اپنے عہد اور حکمران کی شخصیت تک محدود ہے۔

اب تاریخ کا تصور بدل چکا ہے، قرون وسطیٰ کا عہد اور شخصی سلطنتوں کا ذکر ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی تاریخ کا طالب علم، معاشرہ، ادب، فن، ثقافت، نظم حکومت، معاشی و اقتصادی حالات، غرضکہ عوام و خواص کے ہر طبقہ کی زندگی کے ہر پہلو پر معلومات چاہتا ہے، اس کے حصول کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ متعلقہ واقعات اور بیانات کو جن کا ذکر ضمنی طور پر مختلف مقامات پر کیا گیا ہے، یکجا جمع کر کے مرتب کیا جائے، دور جدید کے بعض مورخوں نے اس طرف توجہ کی ہے اور ان مسائل پر مکمل کتابیں یا مقالے تیار کئے گئے ہیں، لیکن یہ اکثر و بیشتر انگریزی میں ہیں، ان حالات کے پیش نظر میں نے یہ کوشش کی ہے کہ

اردو میں چند اہم فنون کا مختصر جائزہ ان صفحات میں پیش کیا جائے، اس جائزہ کو مکمل تصویر تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس سے ان فنون کی ترویج و ترقی میں مسلمانوں کے کارناموں کا اندازہ لگانے میں ان صفحات سے مدد ضرور ملے گی۔

سید معین الحق

اکتوبر ۶۵ء

اسلامی عہد میں فن تعمیر

(ہند - پاکستان)

اسلامی عہد اقتدار کے عظیم ترین کارناموں میں فن تعمیر کی ترقی ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ مسلمانوں کی بنائی ہوئی عمارتیں سینکڑوں برس گزرنے کے بعد آج بھی جبکہ دنیا نے بہت زیادہ ترقی کرلی ہے استعجاب اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اسلامی فن تعمیر کی خصوصیات کا اثر برصغیر کے ہر حصہ میں نمایاں طور پر نظر آنے لگا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اس کے اثرات ان علاقوں میں بھی پہنچ گئے جو مسلمانوں کے زیر اقتدار کبھی نہیں رہے۔ فرانسیسی فاضل لی بان اپنی مشہور کتاب تمدن ہند میں لکھتا ہے:-

"اسلامی اثر ہند میں ہر جگہ نمایاں ہے میں نے اسے نیپال کی عمارتوں میں پایا ہے۔ اگرچہ اسلامی فاتحین کبھی نیپال تک نہیں پہنچے۔ یہی اثر دکن میں بھی موجود ہے۔ یہاں نہ صرف مسلمانوں کی بنائی ہوئی مسجدیں ہی ہیں بلکہ جیسا کہ مدورا میں دیکھا جاتا ہے، ہندو قصر ہیں جن کا طرز اسلامی ہے۔ بعض وقت یہ طرز اس درجہ غالب ہے کہ بہ نگاہ اول

یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت کسی مسلمان کی بنائی ہوئی ہے۔"

ان الفاظ کی اہمیت اس لئے اور بڑھ گئی ہے کہ یہاں اسلامی فن کا اثر ان علاقوں میں قائم ہوا جہاں خود اس فن نے مسلمانوں سے پہلے نمایاں ترقی کر لی تھی۔ایک اور امر بھی قابلِ لحاظ ہے اسلامی اور ہندو فن تعمیر میں زبردست فرق ہے۔ اسلامی فن تعمیر کے اکثر بنیادی تصورات نے سب سے پہلے مسجدوں ہی کی عمارتوں میں جگہ پائی اور وہیں ان کی روایات قائم ہوئیں اسلام کی پہلی اہم عمارت مسجد نبوی[۱] تھی۔ یہ امر اتفاقیہ نہیں کہ مسلم ممالک میں فن تعمیر کے انتہائی کمالات مسجدوں ہی میں نظر آتے ہیں۔مسجدوں کے بعد محلات اور مقابر آتے ہیں۔

فن تعمیر پر انفرادی اور تمدنی ضروریات۔ قومی خصوصیات، اقتصادی حالت آب وہوا اور عمارتی سامان کی دستیابی وغیرہ کا بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ہند پاکستان میں اسلامی اور ہندی فن تعمیر کی مختلف خصوصیات میں جو بنیادی فرق نظر آتا ہے وہ ان ہی عوامل کے اثرات کا نتیجہ ہے۔مثلاً دونوں کی عبادت گاہوں کی ساخت پر غور کیجئے۔ہندوؤں کا مندر ایک مختصر، چاروں طرف سے گھری ہوئی تنگ وتاریک عمارت ہوتی ہے۔ اس کے

---

[۱] ہجرت نبوی کے بعد مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی تعمیر کی گئی، یہ اسلام کی پہلی عمارت تھی، اس کی دیواریں سو ہاتھ یعنی ڈیڑھ سو فٹ لمبی تھیں، اس کی بنیادیں اور احاطہ کی دیوار زمین سے ساڑھے چار فٹ تک پتھر کی تھیں، اس کے بعد کچی اینٹیں استعمال کی گئی تھیں، اس کی چھت کھجور کے تنوں پر قائم کی گئی تھی، اور اس کو سہارا دینے کے لئے اسی کے شہتیر استعمال کئے گئے تھے، کھجور کے پتوں اور مٹی سے چھت تیار ہوئی تھی، اس وقت کعبہ شمال کی جانب یعنی بیت المقدس کی طرف تھا، بعد میں مکہ کی طرف یعنی جنوب کی سمت قرار پایا، شرقی دیوار سے ملحق ازواج مطہرات کے حجرے تھے، جو مسجد کے صحن میں کھلتے تھے، ان میں سے چار اینٹوں کے بنے ہوئے تھے اور پانچ کھجور کے پتوں اور مٹی کے تھے۔

اندر کا ماحول رازدارانہ ہوتا ہے اور مورتی کی پوجا کے لئے ہر شخص تنہا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے مسجد چونکہ مسلمانوں کی نماز باجماعت کے لئے ہوتی ہے اس لئے قدرتاً اس کا وہ حصہ عمارت جس میں عبادت کے لئے لوگ جمع ہوتے ہیں وسیع اور کشادہ ہوتا ہے یہ التزام خاص طور پر ہوتا ہے کہ روشنی اور ہوا زیادہ سے زیادہ اندر آسکے۔ مسجد کی عمارت کے اندر جائیے تو اس کا ماحول صاف اور کھلا ہوا نظر آئے گا۔ ہندو فن تعمیر کی بنیادی خصوصیت بڑے بڑے ستون اور ان پر رکھے ہوئے پتھروں کی چھت تھی۔ اسلامی فن میں محراب اور گنبد نما یا گنبد کی چھتیں خاص طور پر نمایاں ہوتی تھیں۔ ہندو مندروں کو باہر سے دیکھئے تو گاؤدم اٹھتی ہوئی چھت سامنے آئے گی۔ مسجد میں گنبد اور مینار اس کی رونق بڑھاتے ہیں۔ ہندوؤں کا دیوتا ان کی ظاہری آنکھوں کے سامنے مورتی کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ اسلام نہایت سختی کے ساتھ بت پرستی حتیٰ کہ تصویر کشی بہ سلسلہ عبادت کو بھی ناجائز قرار دیتا ہے۔ اسی طرح تزئین اور سجاوٹ اصولوں میں بھی فرق تھا۔ فن تعمیر کے ان بنیادی اختلافات کو سامنے رکھ کر اس پہ غور کیجئے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں میں اخوت اور مساوات انسانی شامل تھے۔ ہندوؤں کے معاشری تصورات، ذات کی سخت گیری تک محدود تھے۔ اسلام ہر بنیادی چیز کو عالمگیر حیثیت دیتا ہے۔ ہندوؤں میں آریہ ورت کے باہر کی زمین اور سمندر قطعاً قابل اعتنا نہیں سمجھے جاتے تھے۔ ہند پاکستان میں داخل ہوتے وقت اسلام کی عمر بہت کم تھی۔ فتح سندھ کے وقت بھی اس تحریک کو صرف سو سال گذرے تھے۔ لیکن اس مختصر زمانہ میں (قوموں کی عمر میں سو سال کی مدت مختصر ہی متصور ہوتی ہے) مسلمانوں نے ہزاروں میل تک کے علاقے فتح کر لئے تھے اور اس زمانہ کی دنیا کا بڑا حصہ ان کے زیر اقتدار آچکا تھا۔ برخلاف اس کے ہندوؤں نے اپنی ہزاروں اور خود ان کے بعض اقوال کے مطابق لاکھوں بلکہ کروڑوں برس کی مدت دراز میں بھی اتنے وسیع علاقوں کو اپنی تہذیب سے متاثر

نہیں کیا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں کی عبادت میں ایک بڑی جماعت لازمی عنصر تھا۔ ہندوؤں کی پوجا انفرادی اصول پر ہوتی تھی۔ ان حالات میں ایک کی کشادگی اور وسعت اور دوسرے کی تنگی وتاریکی یقیناً لازمی تھی۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ رازدارانہ ماحول انفرادی عبادت کے لئے تو مناسب ہوسکتا تھا لیکن جماعتی عبادت کے منافی تھا۔ ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ محراب اور گنبد بغیر مسالہ کے نہیں بن سکتے۔ لیکن چوکور ستون اور بڑے بڑے پتھروں کی سلیں رکھ کر چھت بنانے میں بغیر مسالہ کے یا کمزور مسالہ کے ساتھ کام نکالا جاسکتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ ہندو عمارتوں میں یا تو خالی پتھروں کی چنائی ہوتی تھی یا مٹی کے گارے کی جو زیادہ دیرپا نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے مسلمانوں نے چونا پکا کر جو مسالہ تیار کیا وہ دیرپا بھی ہوتا تھا اور مضبوط بھی۔ موسم اور آب وہوا کی کیفیت اور عمارتی سامان کی موجودگی اور دستیابی بھی طرز عمارت پر اثرانداز ہوتی رہی ہیں مثال کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرد ممالک میں صحن کارآمد نہیں ہوسکتا، اور گرم ممالک میں یہ لازمی ہے، استنبول میں مسجد کا مسقف ہونا ضروری ہے چاہے وہ کتنی ہی وسیع ہو، ہند پاکستان میں عمارت کا زیادہ حصہ کھلا ہوا صحن ہونا چاہیئے۔ برصغیر میں اسلامی فن تعمیر کے ارتقاء کا مطالعہ کرتے وقت ان امور کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔

سلطنت دہلی کا ابتدائی دور ۱۲۰۶-۹۰

ہند پاکستان میں مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات کا سہرا عربوں کے سر ہے۔ تبلیغ مذہب میں بھی ان ہی کو اوّلیت کا فخر حاصل ہے۔ لیکن یہ امر قابل افسوس ہے کہ عرب دور کی کوئی عمارت موجود نہیں۔ حال ہی میں جو کھدائی محکمہ آثار قدیمہ نے کراچی سے تھوڑے فاصلہ پر بھنبور میں کرائی ہے۔ اس میں عربی دور کی ایک مسجد کے آثار ملے ہیں۔ یہ کھدائی ابھی ابتدائی حالت میں ہے اور اس کی بنیاد پر یقین کے

ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہاں یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ مستقبل قریب میں اگر یہ کوشش جاری رہی تو مفید معلومات حاصل کی جاسکیں گی۔ اس کے بعد کا دور یعنی غزنویوں کا زمانہ حقیقتاً فتوحات اور جنگ کا زمانہ تھا۔ ان کی حکومت شمال مغربی علاقوں پر ایک مدّت تک قائم رہی لیکن ان کا دور انحطاط جلد ہی شروع ہوگیا تھا' اس لئے ان کی بھی عمارتیں اس علاقہ میں زیادہ موجود نہیں، اور سب سے پہلے ہم کو سلطان معزالدین بن سام کے عہد یعنی بارہویں صدی کی آخری دور میں بنی ہوئی عمارتیں اس حالت میں ملتی ہیں کہ فن تعمیر کے متعلق ان کو دیکھ کر کچھ نتائج اخذ کئے جاسکیں۔

مسجد قبۃ الاسلام۔ قطب مینار

پہلی بڑی عمارت جس کا ذکر اسلامی فن کی یادگار کے طور پر کیا جاسکتا ہے' پہلے سلطان دہلی یعنی قطب الدین کی بنوائی ہوئی مسجد ہے۔ یہ اسی جگہ واقع ہے جہاں پرتھوی راج کا قلعہ تھا اور اس میں جو سامان لگایا گیا ہے اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ پرانے محلات اور مندروں کی شکستگی کے بعد اس کو اس نئی عمارت میں استعمال کیا گیا ہے۔ بعض مغربی مورخوں نے اس مسجد کا ذکر کرتے ہوئے مندروں کے توڑے جانے پر بہت زور دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ معاصر مورخین نے بھی مندروں کے توڑنے اور ان کا سامان اس میں لگائے جانے کا ذکر کیا ہے بلکہ بعض نے تو عبارت آرائی کے جوش میں اس کو فخر و مباہات کا بھی رنگ دیدیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاسکتی' جنگ کے زمانہ میں اور کبھی کبھی اس کے نتیجہ میں جو ماحول پیدا ہوتا ہے اس میں اُن عمارتوں کی شکست و ریخت اور بربادی' جو مفتوحہ قوم کی شان و شوکت کی نشانیاں سمجھی جاتی ہیں، کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں۔ نہ یہ مسلمان فاتحین کے ساتھ مخصوص ہے' یورپ کی دونوں عظیم جنگوں سے تباہ شدہ عمارتوں میں گرجوں کی تعداد کافی تھی' حالانکہ جانبین کی افواج میں سپاہیوں کی کثیر تعداد عیسائیوں کی تھی۔ خود ہمارے

برصغیر میں ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے موقعہ پر لاتعداد مسجدوں پر غیر مسلموں نے قبضہ کیا اور کانگریس کے یک قومی نظریہ کے باوجود کانگریسی حکومت نے مساجد و مقابر کی تباہی کو غیر معمولی واقعہ نہیں سمجھا۔ آج (۱۹۶۴ء) بھی ہندوستان میں مسجدیں غیر مسلموں کے قبضہ میں ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر مورخوں کے اس رویہ کی تعریف نہیں کی جاسکتی کہ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا مسلمان فاتحین عبادت گاہوں کے توڑنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ کھنڈرات کی جگہ نئی عمارت بناتے وقت ملبہ کی صفائی کے سلسلہ میں وہ سامان جو قابل استعمال ہوتا تھا نئی تعمیرات کے لئے ہی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ ان حالات میں یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ مسجد قبۃ الاسلام کے اس حصہ میں جو ابتدا ءمیں قطب الدین نے بنوایا، پتھروں کے وہ ٹکڑے استعمال کئے گئے جو یقیناً دوسری عمارتوں کی شکست کے بعد ملے ہوں گے۔ ان میں سے بعض میں بتوں کی مورتیاں بھی بنی ہوئی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ کچھ پتھر مندروں کے ہیں۔ لیکن یہ قیاس صحیح نہ ہوگا کہ ایسے سارے پتھر مندروں ہی کے ہیں کیوں کہ ہندوؤں میں یہ عام دستور تھا کہ اپنے دیوتاؤں کی مورتیاں گھروں میں بھی رکھتے تھے۔ حکمرانوں کے محلات میں بھی یہ مورتیاں ہوتی تھیں۔

مسجد قبۃ الاسلام کا وہ حصہ جو سب سے پہلے تیار ہوا تھا اس ترکیب سے بنایا گیا تھا کہ صحن (جو ۱۴۲ × ۱۵۰ فٹ تھا) کے چاروں طرف برآمدے تھے اور مغربی یعنی قبلہ کی جانب کو چھوڑ کر تین طرف داخل ہونے کے لئے دروازے تھے۔ دو سال بعد قبلہ کی جانب والے برآمدے کے آگے ایک محراب دار دیوار بنوائی گئی جس کی اونچائی وسط میں پچاس فٹ ہے اور لمبائی یا اس کو چوڑائی کہہ سکتے ہیں ایک سو آٹھ فٹ ہے۔ اس میں پانچ محرابیں ہیں اور درمیان کی محراب ۵۴ فٹ اونچی اور ۲۲ فٹ چوڑی ہے۔ پوری دیوار پر نقش و نگار ہیں اور کثرت سے قرآن شریف کی آیتیں کندہ ہیں۔ کھدائی کا کام اس قدر عمدہ ہے کہ حسن نظامی مصنف تاج المآثر کے، یہ الفاظ کہ آیات قرآنی کو پتھر پر اس طرح کھودا گیا ہے

جیسے کہ وہ پتھر نہیں بلکہ موم ہے، کسی صورت سے مبالغہ آمیز نہیں کہے جا سکتے۔ قطب الدین ایبک کے بعد سلطان التمش نے اس مسجد میں اضافہ کیا۔ دالان کے دونوں طرف ایک ایک اور دالان بنوایا اور ان کے سامنے محراب دار دیواریں بھی تیار کرائیں۔ اس دیوار پر جو نقش و نگار ہیں وہ خالص اسلامی نمونے کے ہیں صحن کو بھی اسی تناسب سے زیادہ وسیع کیا گیا۔ اس کے بعد علاؤ الدین خلجی نے اس کو اور بڑھایا اور اب اس کے صحن کا رقبہ بہت زیادہ ہو گیا۔ مسجد کے صحن کے اندر ہی، مشرقی جانب سے داخل ہوتے وقت بائیں جانب قطب مینار ہے جو کئی حیثیتوں سے یکتا تعمیر کہی جا سکتی ہے۔ اس مینار کی ابتداء قطب الدین نے ہی کی تھی لیکن اس کے زمانہ میں پہلی منزل بھی مکمل نہ ہو سکی۔ التمش نے چار منزلیں بنا کر اس کو مکمل کیا اور اس عہد کے بزرگ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے نام پر جن کا سلطان بے حد معتقد تھا اس کو قطب مینار کہا۔ قطب مینار کی چاروں منزلوں کی اونچائی ۲۲۵ فٹ تھی، بعد میں سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں بجلی سے اوپر کی منزل کو نقصان پہنچنے کی وجہ سے جب اس کی مرمت کی گئی تو دو چھوٹی چھوٹی منزلیں اور بنا دی گئیں اور اس طرح اس کی اونچائی بھی ۲۳۴ فٹ ہو گئی۔ مینار میں چند جگہ ناگری خط میں مختصر الفاظ کندہ ہیں اور ان کی وجہ سے بعض فضلاء نے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ہندوؤں کا بنوایا ہوا ہے۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے اس لئے کہ ہندوؤں کے فن تعمیر میں مینار کا تصور ہی نہیں۔ علاوہ ازیں اُس پر قرآن کی آیتیں اور اسلامی طرز کے نقش و نگار ہیں۔ ایک پتھر کی سل جو ایک دروازہ کے اوپر رکھی ہوئی ہے اور جس پر ہندی کی عبارت ہے یقیناً کسی دوسری شکستہ عمارت کے ملبہ میں سے نکال کر اسی طرح لگا دی گئی ہے۔ ایک انگریز ماہر فرگسن کی یہ رائے صحیح ہے کہ مینار کی حیثیت سے قطب مینار دنیا میں سب سے مکمل تعمیر کہی جا سکتی ہے۔

التمش کی ایک اور قابل ذکر عمارت اجمیر میں ڈھائی دن کا جھونپڑا ہے یہ بھی

مسجد ہے جو قطب الدین نے شروع کی تھی اور التتمش کے ہاتھوں مکمل ہوئی۔ روایت تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ نام اس وجہ سے دیا گیا کہ اُس کی تعمیر ڈھائی دن میں ہوئی لیکن یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں، دوسری روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اس کے قریب ہی ایک میلہ لگتا تھا جو ڈھائی دن رہتا تھا اس کی وجہ سے یہ نام پڑ گیا۔ اجمیر کی مسجد اگرچہ بنیادی طور پر مسجد قبتہ الاسلام ہی کے اصولوں پر بنائی گئی ہے لیکن اس میں وہ خوبصورتی پیدا نہیں ہوسکی جو موخرالذکر میں ہے۔ التتمش کے بعد بلبن کا مقبرہ بھی قابل ذکر ہے یہ ایک سادہ عمارت ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جو محراب دار دروازے بنائے گئے ہیں وہ اصول کے لحاظ سے صحیح محرابیں ہیں۔ التتمش کے عہد میں جو محرابیں تیار ہوئیں وہ محراب کی ڈاٹ کے اصول پر نہ تھیں بلکہ اسی اصول پر تھیں جو ہندو چھت کے تیار کرنے میں استعمال کرتے تھے یعنی ایک پتھر پر دوسرا پتھر اس طرح رکھا جائے کہ اوپر والا کچھ آگے کو نکل آئے۔ دونوں جانب سے جب یہ پتھر رکھے جاتے تھے تو آخر میں مل کر وہ محرابی شکل بنا دیتے تھے۔ بلبن کے مقبرے میں باقاعدہ ڈاٹ لگا کر محرابیں تیار کرائی گئیں ہیں۔ اس مختصر اور سادہ عمارت کی یہ ہی اہمیت ہے۔

خلجیوں کا عہد ۱۲۹۰ - ۱۳۲۰ء

جماعت خانہ شیخ نظام الدین اولیاؒ

علائی دروازہ

سلطنت دہلی کے قیام کو سو برس نہیں گذرے تھے کہ حکمران خاندان بدل گیا، نئے خاندان یعنی خلجی سلاطین میں دوسرا بادشاہ علاء الدین مختلف حیثیتوں سے اس دور کی عظیم شخصیتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایک سو سال کی مدت میں اسلامی فن تعمیر نے نمایاں ترقی کر لی تھی اور اس کی بنیادی روایات نے مستقل حیثیت اختیار کر لی تھی

اب مسلمانوں کی عمارتیں خالص اسلامی طرز کی ہونے لگی تھیں۔ ہندو فن کا اثر کہیں ہوتا بھی تھا تو برائے نام۔ علائی عہد کی دو عمارتیں قابل ذکر ہیں۔ درگاہِ شیخ نظام الدین اولیاءؒ میں جماعت خانہ کی عمارت اس لئے اہم ہے کہ وہ پہلی مسجد ہے جو خالص اسلامی طرز اور اسلامی فن تعمیر کی روایات کے مطابق تعمیر ہوئی ہے۔ اس میں سب نیا سامان لگایا گیا ہے۔ عمارت سرخ پتھر کی ہے جس میں تین کمرے ہیں۔ وسط کا کمرہ چوکور ہے یعنی چاروں دیواریں برابر ہیں۔ اور دونوں طرف کے کمرے مستطیل ہیں۔ چھتیں گنبدوں کی ہیں۔ اگرچہ گنبد زیادہ وسیع نہیں۔ سامنے کی دیوار میں اور اندر کی محرابوں پر قرآن کی آیتیں کندہ ہیں۔ روایت کے مطابق علاءالدین خلجی کے بڑے بیٹے شہزادہ خضر خاں نے یہ عمارت اپنے مرشد شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مقبرہ کے لئے تیار کرائی تھی لیکن شیخ کی خواہش پر اس خیال کو ترک کر کے اس کو مسجد بنایا گیا اور بعد میں دونوں طرف کمرے بنوائے گئے۔ بہر حال یہ اسلامی دور کی اہم ترین عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے۔

علائی دروازہ مسجد قبۃ الاسلام کے اس حصہ میں داخل ہونے کے لئے تیار کیا گیا تھا جو علاءالدین نے بڑھایا تھا۔ سر جان مارشل جو ایک زمانہ میں ہند پاکستان کے محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر تھے اور جن کی رائے فن تعمیر سے متعلق معاملات میں مستند خیال کی جاتی ہے علائی دروازہ کو تعمیری کارنامہ کا ایک لاجواب ہیرا کہتے ہیں[1]۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے کچھ حصے ٹوٹ جانے کے باوجود کوئی دیکھنے والا اس کی شاندار خوبصورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک چوکور کمرہ ہے جس کی چھت گنبد کی ہے اور جس کی چاروں دیواروں میں بڑی اور اونچی محرابیں ہیں۔ سرخ پتھر کے علاوہ اس میں سنگ مرمر بھی استعمال ہوا ہے اور قرآن کی آیتیں بھی

---

[1] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ۳ - ص ۵۸۳

کندہ ہیں۔ من حیث المجموع علائی دروازہ اپنی ایک مخصوص شان رکھتا ہے"۔ علاءالدین کی تعمیرات کے سلسلہ میں حوض خاص یا حوض علائی اور سیری کے شہر کا ذکر بھی ضروری ہے موخرالذکر کے کھنڈرات میں صرف اس کی فصیل کی دیوار کے کہیں کہیں کچھ آثار باقی ہیں۔ حوض علائی کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ فیروز شاہ نے اپنی یونیورسٹی اور دیگر عمارات جن کا ذکر آگے کیا جائے گا اسی کے کنارے پر بنوائیں۔

تغلق عہد ۱۳۲۱-۱۴۱۴ء

تغلق خاندان کے پہلے تین بادشاہ یعنی سلطان تغلق شاہ، سلطان محمد بن تغلق اور سلطان فیروز شاہ، نہایت متین اور جفاکش حکمران تھے۔ یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے۔ کہ قطب الدین مبارک شاہ اور اس کے غلام خسرو خان کے چار سالہ دور میں امراء وغیرہ کی عیش پرستی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ لوگ اس سے تنگ آگئے تھے چنانچہ ملک تغلق کے ہاتھوں خسرو خان کی شکست اور قتل کے بعد اس کا ردعمل شروع ہوتا ہے۔ یہ تینوں سلطان مذہب کے پابند تھے اور اسلامی روایات پر عمل کرنے اور ان کو قائم رکھنے کے خواہشمند تھے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ محمد بن تغلق کے اس منصوبے کے ماتحت جس کے نتیجہ میں دہلی کی آبادی کا ایک بڑا حصہ دکن جاکر دولت آباد میں آباد ہوا۔ معماروں اور دوسرے کاریگروں کی بہت بڑی تعداد دہلی سے چلی گئی ہوگی۔ ان تمام باتوں کا اثر ہم کو تغلق سلاطین کی حکومت اور ان کے عہد میں فن تعمیر کی نمایاں خصوصیات میں نظر آتا ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنے لئے نیا دارالحکومت تیار کرایا جو اسی کے نام پر تغلق آباد کہلاتا ہے۔ یہ دہلی کا تیسرا شہر تھا۔ اس سے پہلے علاءالدین نے سیری آباد کیا تھا جو دہلی کے سات شہروں میں دوسرا شہر کہلاتا ہے۔ تغلق آباد کی دیوار کے قریب ہی سلطان غیاث الدین نے اپنے لئے مقبرہ بنوایا تھا۔ تغلق آباد کے وسیع اور مضبوط قلعہ کے کھنڈرات کو دیکھ کر آج بھی ہر شخص مرعوب ہو جاتا ہے۔ تغلق آباد کی

وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ایسا مستطیل تھا جس کی لمبائی چوڑائی دونوں بائیس سو گز سے زیادہ تھیں۔ اس میں باون دروازے تھے جو اس قدر کشادہ تھے کہ ہاتھی آسانی سے ان میں داخل ہو سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے کھنڈرات کو دنیا کے عظیم ترین کھنڈرات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس عمارت کے بنانے والے کی اولوالعزمی اور بلند آہنگی کی زندہ شہادت ہیں۔ ابن بطوطہ کے زمانہ میں اس کے محلات اور عمارتیں قابل دید تھیں۔

مقبرہ کی عمارت ایک وسیع تالاب میں ہے جو اسی مقصد کے لئے بنایا گیا تھا۔ یہ تغلق آباد کے قلعہ سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ عمارت کے ہر طرف ایک مضبوط اور چوڑا پشتہ ہے جس نے اس کو زیادہ مضبوط اور دیر پا بنا دیا ہے۔ پشتے اتنے بڑھا کر بنائے گئے ہیں کہ وہ پچھتر درجہ کا زاویہ بناتے ہیں اور عمارت کی شکل من حیث المجموع اہرام کی سی معلوم ہوتی ہے۔ تین طرف محراب دار دروازے ہیں۔ چوتھی یعنی غرب کی جانب محراب ہے لیکن بند ہے۔ دروازہ نہیں۔ محراب کے شروع ہونے تک عمارت خالص سُرخ پتھر کی ہے۔ اس کے بعد کہیں کہیں سنگ مرمر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ خاص طور پر گنبد میں جس سے عمارت کی زینت اور خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس مقبرہ کا گنبد بھی خاص اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ بعد میں اسی شکل کے گنبد تیار ہوئے۔

غیاث الدین کے بیٹے اور جانشین، سلطان محمد بن تغلق کا زمانہ اصلاحی اقدامات کو بروئے کار لانے، مخالفین کی سرکوبی اور بغاوتیں فرو کرنے میں ختم ہوا۔ ان حالات کے پیش نظر یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ بڑے پیمانہ پر تعمیرات کا کام کرنے کا موقع اس کو ملا ہو گا۔ پھر بھی اس سلسلہ میں اس کے کارناموں کے کچھ نشان باقی ہیں۔ اپنے پیش رو کی طرح اس نے بھی ایک نیا شہر تعمیر کیا جس کو جہاں پناہ کا نام دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ جو قلعہ

تھا وہ عادل آباد کہلاتا تھا۔ لیکن جلد ہی سلطان کی دلچسپی کا مرکز دولت آباد بن گیا اور دہلی اگر بالکل نہیں تو ایک حد تک غیر آباد ضرور ہو گئی۔ بہر حال واپسی کے بعد اس نے کچھ عمارتیں تیار کرائیں۔ ابن بطوطہ جو دولت آباد کے دار السلطنت بننے کے سات سال بعد یعنی ۱۳۳۴ء میں یہاں آیا تھا سلطان کے قصر ہزار ستون کا ذکر کیا ہے[۱]۔ اسی قصر ہزار ستون کی ایک چھوٹی سی عمارت بدیع منزل[۲] آج تک موجود ہے۔ مقامی لوگ اسے بجے منڈل کہتے ہیں۔

سلطان فیروز شاہ کی عمارتیں

محمد بن تغلق کا جانشین سلطان فیروز شاہ ہند پاکستان کے ان حکمرانوں میں شمار کیا جاتا ہے جو اپنے اصلاحی کارناموں اور عمارتوں کے لئے خاص طور پر مشہور ہیں۔ دو ہمعصر مورخ یعنی شمس سراج عفیف اور مولف سیرت فیروز شاہی اس سلطان کی بنوائی ہوئی بہت سی عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ہم کو اس کے عہد کے دو بڑے انجنیروں کے نام بھی ملتے ہیں یعنی ملک غازی شحنہ اور عبد الحق، عمارتوں کے علاوہ فیروز شاہ نے کئی نئے شہر بھی تعمیر کئے جن میں جونپور، فتح آباد اور حصار فیروزہ قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر کا نام سلطان محمد بن تغلق کے بچپن کے نام یعنی جونا خان پر رکھا، دوسرا اپنے بیٹے فتح خان اور تیسرا خود اپنے نام پر رکھا۔ ان میں سے جونپور اور حصار فیروزہ آج بھی برصغیر کے بڑے اور مشہور

---

[۱] ابن بطوطہ (مصر۔ ۱۹۳۸ء) جلد دوم ص ۳۵

ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ جس شخص کو سلطان کے حکم سے قتل کیا جاتا ہے وہ محل ہزار ستون کے سامنے ہی قتل ہوتا ہے اور تین روز تک اس کا سر وہاں دروازہ پر لٹکا رہتا ہے۔

محمد بن تغلق کے درباری شاعر بدر چاچ نے اسی مضمون کو شعر میں ضبط کیا ہے:۔

اگر نہ خلد برین ست این ہزار ستون ۔۔۔ چرا فضائے درش عرصہ گاہ روز جزاست

[۲] آثار الصنادید (نولکشور۔ لکھنؤ) ص ۵۴

شہروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اپنے دو پیشروں کی طرح اس نے بھی نیا دارالحکومت اور سلطانی رہائش گاہ یعنی فیروز آباد تعمیر کیا۔ اس کا محل کوٹلہ فیروز شاہ کہلاتا تھا۔ عمارات کے علاوہ سلطان فیروز شاہ نے کئی بڑی بڑی نہریں بھی بنوائیں جن میں سے بعض آج تک موجود ہیں۔

فیروز شاہ کی سلطنت اس کے پیش رو کے مقابلہ میں مختصر تھی۔ دکن تو خود مختار ہو ہی گیا تھا، لیکن سندھ اور بنگال کے وسیع علاقوں کا تعلق بھی مرکز سے اب بہت زیادہ مضبوط نہ تھا، وسعت سلطنت میں کمی کا لازمی نتیجہ آمدنی میں کمی تھی۔ پھر سلطان نے کثرت سے عمارتیں بنوائیں۔ ان حالات میں یہ ضروری ہوگیا کہ کفایت سے کام کیا جائے۔ چنانچہ فیروز شاہ کی بنوائی ہوئی عمارتیں زیادہ شاندار نہیں ....، سادہ ہیں اور ان میں زیادہ قیمت والا سامان نہیں لگایا گیا ہے۔ سرخ پتھر اور سنگ مرمر کی بجائے معمولی پتھر ہے۔ نقش و نگار میں بھی نمایاں کمی واقع نہ ہے۔ کوٹلہ فیروز شاہ شمال میں پہاڑی سے جنوب میں حوض خاص تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں نو مسجدیں، تین محل اور کئی شکار کی جگہیں تھیں۔ کوٹلہ میں دو عمارتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک جامع مسجد اور دوسری وہ جس پر اشوک کا مینار نصب کیا گیا جامع مسجد دو منزلہ عمارت ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی چھت پر چھوٹے چھوٹے متعدد گنبد ہیں۔ مسجد کے سامنے ایک مخروطی شکل کی عمارت پر اشوک کا مینار نصب کیا گیا ہے۔

کوٹلہ فیروز شاہ میں یہ جگہ بہت نمایاں ہے۔ مسجد کے سامنے ایک مخروطی شکل کی عمارت پر اشوک کا مینار آج بھی دور سے نظر آتا ہے۔ یہ امر فیروز شاہ کے ذوق کی زندہ شہادت ہے کہ اس نے راجہ اشوک کے دو مینار دوسرے مقامات سے منگوا کر دہلی میں نصب کرائے۔ وہ مینار جو مسجد کے سامنے ہے انبالہ میں ایک گاؤں میں تھا وہاں سے منگوا لیا گیا۔ دوسرا میرٹھ کے قریب سے منگوا کر کوشک شکار میں

نصب کرایا گیا۔ ان میناروں کو جو اس قدر وزنی اور بڑے ہیں اس طرح سے گرانا کہ ان کو نقصان نہیں پہنچا، پھر ایک کو تقریباً ڈیڑھ سو میل اور دوسرے کو چالیس پچاس میل سے لاکر دوبارہ نصب کرانا خود ایک کارنامہ ہے[1]۔ اور ایسا کارنامہ جس کی داد مغربی مورخوں نے بھی دی ہے۔ فنی لحاظ سے کوٹلہ سے کہیں زیادہ قابل توجہ فیروز شاہ کی وہ یونیورسٹی ہے جو اس نے حوض خاص کے کنارے پر تیار کرائی۔ اس کے کچھ آثار باقی ہیں جن سے اس کی عظمت رفتہ اور وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی عمارتوں کا سلسلہ حوض کے شمال کنارے پر چار سو فٹ اور مغربی جانب دو سو پچاس فٹ تک پھیلا ہوا تھا۔ شمالی کنارے والی عمارتیں حوض کی طرف دو منزلہ اور دوسری طرف یک منزلہ تھیں۔ یہ دالان کی شکل کی ہیں اور کچھ کچھ فاصلہ پر چوکور وسیع کمرے ہیں۔ یونیورسٹی کی عمارتوں کی وسعت اور شان کو دیکھ کر ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فیروز شاہ تعلیم کو کتنی اہمیت دیتا تھا۔ حوض کے جنوب مشرقی کنارے پر فیروز شاہ کا مقبرہ ہے جس کی چھت گنبد کی ہے۔ ان عمارتوں کے ساتھ فیروز شاہ کے عہد کی کئی مسجدیں بھی قابل ذکر ہیں۔ خاص طور پر کالی مسجد، بیگم پوری مسجد، کھڑکی والی مسجد اور کلاں مسجد ہیں۔ فن کے لحاظ سے ایک ہی قسم کی عمارتیں کہی جاسکتی ہیں۔ منجملہ اور خصوصیات کے ان میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس دور کی اور عمارتوں کے مقابلہ میں یہ اس وقت تک

---

[1] شمس سراج عفیف نے بیان کیا ہے کہ مینار کو روئی کے گٹھروں پر آہستہ آہستہ گرایا اور پھر اس کو ایک ایسی گاڑی پر رکھا جس میں ۴۲ پہیئے تھے۔ اس کے بعد دریا کے کنارے پہنچکر اس کو کشتیوں میں رکھا گیا۔ اس طرح فیروز آباد پہنچا اور یہاں نہایت احتیاط سے اس کو اس اونچائی تک پہنچایا گیا جہاں وہ اب موجود ہے۔

دیکھو تاریخ فیروز شاہی (کلکتہ ۱۸۹۰ء) ص ۳۰۵، ۳۱۳

بہت اچھی حالت میں ہیں۔ مسجدوں کے علاوہ خان جہان مقبول تلنگانی کا مقبرہ بھی ایک اہم خصوصیت کا حامل ہے۔ یہ پہلا مقبرہ ہے جس کی عمارت ہشت پہل ہے، بعد میں اس کا کافی رواج ہوگیا۔ ایک انگریز مصنف پرسی براون کا خیال ہے کہ شاید یہ نیا طرز کسی مقامی صناع ہی کی ایجاد ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ شکل میں اور فنی خصوصیات کے لحاظ سے وہ حضرت عمرؓ کی مشہور مسجد سے مشابہ ہے جو بیت المقدس میں واقع ہے۔[۱]

سید اور لودیوں کا دور ۱۴-۱۴-۱۵۲۶ء

ان دونوں خاندانوں کے دور حکومت میں سلطنت دہلی کی حدود مختصر ہوگئی تھیں اور یہ امید کرنا غلط ہوگا کہ اس عہد میں بڑی اور کثرت سے عمارتیں تعمیر ہوئی ہوں گی لیکن پھر بھی سلاطین اور امراء کے مقبرے فن تعمیر کے نقطۂ نظر سے اہم اور ان کی بعض خصوصیات قابل ذکر ہیں۔ سب سے پہلے سید مبارک شاہ کے مقبرے کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس کا گنبد خان جہان کے مقبرہ کے گنبد سے بلند ہے۔ دیواروں پر ایک نیا اضافہ گلدستوں کا ہے۔ دوسری نئی چیز چھتریاں ہیں۔ اس کے بعد سید محمد شاہ کا مقبرہ تیار ہوا جس کا گنبد اس سے بھی زیادہ بلند ہے اور چھتریاں بلند بھی ہیں اور تعداد میں زیادہ بھی کردی گئی ہیں۔ برآمدے بھی کافی بلند اور کشادہ ہیں ان میں سے بعض خصوصیات بعد کی عمارتوں میں بھی قائم رکھی گئی ہیں۔

سکندر لودی کے مقبرہ میں جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کے بیٹے اور جانشین ابراہیم نے بنوایا ٹائل کافی تعداد میں لگائے گئے ہیں اور یہ کئی رنگ کے ہیں۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا گنبد دوہرا ہے۔ یعنی تلے اوپر دو گنبد ہیں۔ یہ طریقہ غالباً شام

---

[۱] پرسی براؤن - انڈین آرکیٹکچر (بمبئی ۱۹۴۲ء)۔ اسلامی دور ص ۲۵

میں ایجاد کیا گیا اور وہاں سے دوسرے اسلامی ممالک میں پہنچا۔ دوہرے گنبد کی ضرورت اس لئے پڑتی تھی کہ ایک گنبد زیادہ اونچا نہیں اٹھایا جاسکتا تھا اور عمارت کے بڑے ہونے اور اس میں نئی چیزوں کے اضافے کے بعد گنبد کا اس کے ساتھ تناسب بگڑ جاتا تھا۔ اس کو قائم رکھنے کے لئے یہ حل تلاش کیا گیا۔ سب سے پہلے برصغیر میں دوہرا گنبد شہاب الدین تاج خان کے مقبرہ میں ۱۵۰۱ء میں بنایا گیا اور کچھ مدت کے بعد سکندر لودی کے مقبرہ میں۔ دوہرے گنبد کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مغلیہ عمارتوں کی وہ ایک نمایاں خصوصیت بن گیا۔ اس عہد کی مسجدوں میں موٹھ کی مسجد خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ سکندر لودی کے وزیر نے بنوائی تھی۔ اس کی شکل اور وسعت کے علاوہ سامنے کی دیوار کی محرابیں، تینوں گنبدوں کی وسعت اور ان کے درمیان فصل، دروازہ کا خاص طرز۔ مینار جو پیچھے کی طرف ہیں اور پلاسٹر میں نقش و نگار۔ یہ سب چیزیں مل کر اس مسجد کو فن تعمیر کے کارنامے کی حیثیت دیتی ہیں۔

مقبرہ شیخ رکن عالم

دہلی کے علاوہ مختلف علاقوں یا جیسا کہ اکثر مورخ لکھتے ہیں "صوبائی سلطنتوں[1]" میں فن تعمیر کے جس قدر آثار موجود ہیں، ان کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہر علاقے کی خصوصیات اور تمدن کا ان پر کتنا اثر تھا۔ ملتان شروع ہی سے اسلامی تہذیب کا مرکز بن گیا اور محمد بن قاسم کے زمانہ سے

---

[1] علاقائی یا صوبائی عمارتوں کا حال بہت اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے، یہاں معمولی تفصیلات کی بھی گنجائش نہیں تھی، لیکن ان مختصر بیانات سے بھی ہم کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ علاقائی حکومتوں کے سربراہوں اور امراء نے اسلامی فن تعمیر کی روایات کو زندہ رکھنے اور اس فن کو ترقی دینے کے سلسلہ میں کس قدر شاندار اقدامات کئے۔

سکھ راج قائم ہونے تک اس پر مسلمانوں کے کسی نہ کسی خاندان کی حکومت رہی۔ افسوس ہے کہ اس علاقہ میں ابتدائی دور کی کوئی عمارت باقی نہیں، بہرحال تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی کی بعض عمارتیں قابل ذکر ہیں۔ حضرت شیخ بہاءالدین زکریا کے مزار مبارک کے متعلق یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ وہ انہوں نے خود ہی تعمیر کرایا تھا۔ عمارت کی کرسی بہت بلند ہے۔ سامنے کی دیوار میں ایک بڑا محراب دار دروازہ ہے۔ چھت کا گنبد ایک ہشت پہل ڈرم پر قائم ہے جس کی ہر جانب ایک کھلی ہوئی محراب ہے۔ عمارت سادہ ہے لیکن باوقار، اس سے متانت اور سنجیدگی ٹپکتی ہے جس سے ہر دیکھنے والا متاثر ہوتا ہے۔ اسی دور اور اسی نمونہ کی دوسری عمارت شیخ شمس تبریزی کا مقبرہ ہے۔ شیخ بہاءالحق کے پوتے شیخ رکن عالم کا مزار برصغیر کی مشہور ترین عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ سرجان مارشل کی رائے میں تو وہ دنیا کے بہترین مقبروں میں سے ایک ہے یہ عمارت ۱۱۵ فٹ بلند ہے اور اس کا قطر ۹۰ فٹ ہے۔ عمارت ہشت پہل ہے اور باہر کی طرف پشتوں کی وجہ سے اس کی پائداری میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ٹائلوں کی وجہ سے اس کی زیب و زینت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ غرضکہ ہر لحاظ سے یہ عمارت نہایت خوبصورت، پائدار اور پر وقار ہے۔

علاقائی حکومتیں

بنگال

بنگال کا دارالحکومت غور (لکھنوتی) تھا۔ لیکن اس عہد کی سب سے قدیم مشہور عمارت جو اس وقت تک باقی ہے ضلع ہگلی میں تربینی کے مقام پر ظفر خان غازی کا مقبرہ اور مسجد ہے۔ مسجد کی موجودہ عمارت یقیناً بعد کی تعمیر ہے۔ لیکن اس میں ایک کتبہ عربی میں موجود ہے جس میں ظفر خان کا جنوبی بنگال کے علاقہ کو ۱۲۹۸ء میں سلطان رکن الدین کیکاؤس کے عہد میں فتح کرنے کا ذکر ہے۔ دوسری قابل ذکر عمارت چوبیس پرگنہ میں بسیر ہاٹ کے مقام پر سالک مسجد ہے جو ۱۳۰۵ء میں تعمیر کی گئی۔ بنگال کے دارلحکومت پانڈوہ کی مشہور عمارت آدینہ مسجد ہے جو سکندر شاہ کے عہد میں تیار ہوئی۔ مسجد کی لمبائی شمالاً جنوباً پانچ سو سات فٹ چھ انچ ہے اور چوڑائی دوسو بچاسی فٹ چھ انچ ہے۔ صحن کے چاروں طرف دیواریں تھیں جن میں ۸۸ محرابیں تھیں۔ مسجد کے اندر منبر کے ساتھ ایک بلند محراب ہے جس پر نہایت عمدہ کام ہو رہا ہے۔ آدینہ مسجد نہایت وسیع عمارت ہے، اور اس کی شان، سادگی اور متانت میں ہے۔ اسی بادشاہ کے عہد کا غور میں شیخ سراج اخی کا مقبرہ اور مسجد ہے۔

لیکن اس میں بعد کی مرمتوں میں بہت تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔ پانڈوہ میں جلال الدین محمد شاہ کا ایک لاکھی مقبرہ بھی قابل ذکر ہے۔ یہ بنگال کی بہترین عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے اور بعد کی مشہور عمارتیں اکثر اسی کے نمونہ پر تیار ہوئیں۔ یہ ایک سادہ طرز کی عمارت ہے جو ۷۵ فٹ لمبی اور اسی قدر چوڑی ہے۔ چاروں کونوں پر مینارے ہیں اور چھت پر گنبد، عمارت پکی اینٹ کی ہے اور باہر کی طرف مسالہ میں کام بھی ہو رہا ہے اور کارنس میں ٹائل بھی لگائے گئے ہیں۔

پندرہویں صدی کے نصف آخر میں الیاس شاہی حکمرانوں کے عہد میں متعدد اور عمدہ عمارتیں تیار ہوئیں۔ ان میں سے بعض قابل ذکر ہیں۔ باگرہاٹ کی ساٹھ گنبد والی مسجد میں کونوں کے مینار نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ دہلی کے تغلق عہد کے طرز عمارت پر بنوائی گئی ہے۔ غور کا داخل دروازہ بھی قابل ذکر ہے۔ یہ ساٹھ فٹ بلند ہے اور ایک سو تیرہ فٹ گہرائی میں ہے۔ اس کی چوڑائی ۷۵ فٹ کے قریب ہے۔ چاروں کونوں پر پانچ منزلہ مینار ہیں۔ پندرہویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے ابتدائی حصہ میں کئی عمارتیں تیار ہوئیں جو قابل ذکر کہی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر غور ہی میں ہیں مثلاً چھکئی مسجد (قریب ۱۴۷۵ء کے) درس باری مسجد اور لوٹن مسجد (قریب ۱۴۸۰ء کے)، چھوٹا سونا مسجد (۱۵۱۰ء) اور بڑا سونا مسجد (۱۵۲۶ء) اور قدم رسول مسجد (۱۵۳۰ء)، باگھا (ضلع راجشاہی) میں بھی ایک مسجد ہے جو ۱۵۲۳ء میں تیار ہوئی۔ آخری چاروں عمارتیں، حسین شاہ (۱۴۹۳ - ۱۵۵۲ء) کی بنوائی ہوئی ہیں دونوں سونا مسجدوں کے نام سونے پر اس لئے تھی کہ ان کے گنبد سونے کی طرح چمکتے تھے۔ یہ دونوں عمارتیں اینٹ کی بنی ہوئی ہیں لیکن اندر کہیں کہیں اور باہر سب میں اوپر سے پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ چھوٹی سونا مسجد میں سامنے کی دیوار میں پانچ محراب دار در ہیں اور بڑی میں گیارہ۔ بڑی سونا مسجد جس کو فرگوسن "گور میں آثار قدیمہ کی بہترین

یادگار" کہتا ہے ایک سادہ مگر باوقار اور وسیع عمارت ہے۔ اس کا صحن دو سو فٹ لمبا اور اسی قدر چوڑا ہے اور قبلہ کی طرف دیوار کو چھوڑ کر باقی تین دیواروں کے درمیان میں خوبصورت محراب دار دروازے ہیں۔ اصل عمارت ایک سو اڑسٹھ فٹ لمبی اور چھہتر فٹ چوڑی ہے۔ قبلہ کی جانب دیوار میں خوبصورت محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ ان کے اور چند اور مسجدوں کے علاوہ فیروز مینار بھی قابل ذکر ہے۔ یہ ۱۴۸۸ء میں تیار ہوا اور فتح کی یادگار کے طور پر یا زمانہ کی حیثیت سے بنایا گیا ہوگا۔ اس کی بلندی چوراسی فٹ ہے۔ نیچے کی تین منزلیں بارہ پہلوؤں کی ہیں اوپر کی دو منزلیں گول ہیں۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ٹائلوں سے اس کو زینت دی گئی ہے۔ مختصراً بنگال کے فن تعمیر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اتنی ترقی تو نہیں کی جیسی اس فن نے دہلی میں کی لیکن بعض بعض عمارتیں مثلاً آدینہ مسجد اور داخل دروازہ بہترین عمارتوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں کے ماہرین فن نے اپنی مخصوص آب و ہوا اور عمارتی سامان کی دستیابی کے پیش نظر عمارتوں کو مضبوط، دیرپا اور دیدہ زیب بنانے میں جو نئے طریقے ایجاد کئے وہ قابل تعریف ہیں۔ بنگالی طرز تعمیر صرف بنگال ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کا اثر آسام تک چلا گیا ہے۔ اس کے لئے سب ساگر کے ضلع میں دیماپور کے کھنڈرات، بالخصوص وہاں کا بڑا دروازہ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اس کا نوکیلی محراب والا دَر۔ کونوں پر ہشت پہل مینارے اور خم دار کارنس، وہ خصوصیات ہیں جو صاف طور پر یہ بتلا رہی ہیں کہ وہ خالص اسلامی فن تعمیر کا نمونہ ہے۔

جونپور

سلطنت جونپور جس کو شرقی سلطنت بھی کہا جاتا ہے دہلی سے عرصہ تک برسرپیکار رہی، چنانچہ اس کی بہت سی عمارتیں شکستہ ہو گئیں اور اب ان کے آثار بھی

باقی نہیں۔ ان میں چند قابل ذکر ہیں۔ خاص طور پر اٹالہ مسجد جو برصغیر کی مشہور عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے، یہ ابراہیم شاہ شرقی کی بنوائی ہوئی عمارت ہے جو ۱۴۰۸ء میں تیار ہوئی۔ وہ تغلقی عمارتوں سے اس قدر مشابہ ہے کہ اگر باہر سے اس کے گنبد اور پشت کی دیوار کو دیکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ دہلی ہی کی عمارت ہے۔ اور کام کے لحاظ سے تو وہ ان سے کہیں بہتر ہے۔ سامنے کی دیوار کو اس قدر وسیع اور بلند بنایا گیا ہے کہ وہی سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔ اس کے صحن کی لمبائی اور چوڑائی دونوں ایک سو ستتر فٹ ہیں تینوں طرف دالان ہیں جن میں سے ہر ایک کی چوڑائی بیالیس فٹ ہے۔ ان میں پانچ گھیں ہیں اور سب دو منزلی ہیں۔ نیچے کی دو منزلیں باہر سڑک کی طرف کو کھلتی ہیں۔ شاید یہ حصہ مسافروں اور آنے والوں کی سہولت کے لئے رکھا گیا ہوگا۔ اندر کی عمارت بلند کرنے اور اس کا تناسب قائم رکھنے کی نہایت کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ من حیث المجموع، جونپور کی اٹالہ مسجد نہایت خوبصورت اور وسیع عمارت ہے جس کی ماہرین فن نے بہت تعریف کی ہے۔ اٹالہ مسجد سے مشابہ اور اسی طرز پر ایک اور مسجد اسی زمانہ میں تیار ہوئی۔ یہ جھنجھری مسجد کہلاتی ہے اور اٹالہ مسجد سے اس قدر مشابہت رکھتی ہے کہ ماہرین کا خیال ہے کہ شاید دونوں کا معمار ایک ہی شخص تھا جو اپنے فن میں بہت مہارت رکھتا تھا۔ لال دروازہ محمود شاہ (۱۴۴۰-۱۴۵۶ء) کے عہد میں تیار ہوا۔ لیکن اس سے زیادہ بہتر اور قابل ذکر جامع مسجد ہے۔ یہ حسین شاہ نے جو ۱۴۵۸ء میں تخت نشین ہوا بنوائی تھی۔ اس کی اندر کی عمارت دو سو پینتیس فٹ لمبی ہے اور پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ بیچ کا حصہ مربع ہے اور اس پر ایک بڑا گنبد ہے۔ اس کے دونوں طرف ایک چھوٹا سا کمرہ نما حصہ عورتوں کے لئے ہے۔ اس کے بعد میں ایک بڑا ہال ہے جو پچاس فٹ لمبا اور چالیس فٹ چوڑا ہے۔ بیچ کا چوکور حصہ اگرچہ اس قدر شاندار تو نہیں جیسا کہ اٹالہ مسجد میں ہے لیکن پھر بھی پر وقار ہے۔

مالوہ و گجرات

گجرات، سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں سلطنت دہلی میں شامل ہوا۔ اس وقت برصغیر میں اسلامی فن تعمیر بہت زیادہ ترقی کر چکا تھا۔ یہ بات بعید از قرائن نہیں کہی جاسکتی کہ دہلی کے کچھ کاریگر اور معمار گجرات بھی پہنچ گئے ہوں۔ بہر حال دہلی کا اثر گجرات کی اس دور کی عمارتوں میں بہت نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر کھمبایت کی جامع مسجد یا بہلول خان قاضی کی مسجد ڈھولکہ پیش کی جاسکتی ہیں اول الذکر ۱۳۲۵ء یعنی حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے جماعت خانہ سے صرف پندرہ سال بعد تعمیر ہوئی۔ آٹھ سال بعد بہلول خان کی مسجد بنی۔ لیکن اس کے بعد فن تعمیر کی ترقی کے لئے حالات اس وقت تک سازگار نہیں ہوئے جب تک گجرات میں خود مختار حکومت قائم نہ ہوئی پہلا خود مختار حکمران جو اپنے تعمیری کارناموں کے لئے مشہور ہے سلطان احمد شاہ تھا۔ اس نے ۱۴۱۱ء میں احمد آباد کا شہر تعمیر کیا اور اس کے علاوہ سون گڑھ، احمد نگر اور دوہد میں قلعے بنوائے۔

احمد آباد

نئے دار الحکومت میں سلطان کی سرپرستی میں بہت جلد اور شاندار عمارتیں تیار ہو گئیں۔ آج وہاں کم و بیش پچاس اچھی مسجدیں آثار قدیمہ میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ شہر سابرمتی دریا کے کنارے پر آباد کیا گیا تھا۔ شاہی محل نہایت نمایاں مقام پر بنایا گیا۔ اس سے کچھ فاصلہ پر جامع مسجد تھی۔ محل سے یہاں تک ایک وسیع شارع بنائی گئی تھی اور اسی پر ایک بڑا محراب دار دروازہ تھا جو شاہی محل کا بیرونی دروازہ سمجھا جاسکتا ہے۔ عمارت وغیرہ کا غور سے معائنہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ سارا شہر ایک خاص اور باقاعدہ منصوبہ کے تحت تیار کیا گیا تھا۔ بانیٔ احمد آباد کے عہد کی چار مسجدیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں یعنی شاہی محل کی احمد شاہی مسجد، ہیبت خان کی مسجد، سید عالم کی مسجد اور جامع مسجد۔ ان میں آخر الذکر کو مغربی علاقوں میں تعمیر مسجد کے انتہائی کمال کا نمونہ کہا گیا ہے۔ اس کا صحن دو سو چھپن فٹ لمبا اور دو سو بیس فٹ چوڑا ہے۔ اندر کی دیوار نہایت وسیع

ہے اور اس سے عمارت کی شان میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ اس دیوار کی ایک نمایاں خصوصیت اس کے عمدہ ستون ہیں۔ دونوں کی محرابیں وسیع ہونے کے علاوہ دیدہ زیب بھی ہیں۔ وسط کی محراب کے دونوں طرف مینار ہے ہیں جن میں نقاشی کا کام ہے۔ عمارت کے اندر کا حصہ دو سو پانچ فٹ لمبا اور پچانوے فٹ چوڑا ہے۔ اس میں تین سو ستون ہیں جو اس قدر قریب ہوگئے ہیں کہ ان کے درمیان فاصلہ صرف پانچ فٹ ہے لیکن ان کو ترتیب سے لگایا گیا ہے اور ان سے جو حصے بنے ہیں ان پر گنبد قائم کئے گئے ہیں۔ غرضکہ اپنی چند در چند خصوصیات اور خوبیوں کے ساتھ احمد آباد کی جامع مسجد ایک لاجواب عمارت مانی گئی ہے۔ احمد شاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے محمد شاہ نے باپ کا مقبرہ مکمل کرایا۔ یہ مقبرہ احمد شاہ نے خود اپنی زندگی ہی میں شروع کرادیا تھا۔ محمد شاہ نے اپنے مختصر دور حکومت (۱۴۴۲ - ۱۴۵۱ء) میں سرکھیج میں جو احمد آباد سے چند ہی میل پر ہے، شیخ احمد کھتو کا مقبرہ اور ایک مسجد تیار کرانا شروع کیں۔ شیخ کی وفات ۱۴۴۶ء میں ہوئی اس لئے یہ عمارتیں محمد شاہ کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکیں اور اس کے جانشین نے ان کی تکمیل کی۔ اس وقت سے سرکھیج کی اہمیت بڑھنے لگی، بالآخر سلاطین گجرات نے وہاں سکونت اختیار کی اور بکثرت محلات، مسجدیں اور دوسری عمارتیں وہاں وجود میں آگئیں۔

۱۴۵۹ء میں سلطان محمود بیگڑہ تخت پر بیٹھا۔ اس کا باون سالہ دور حکومت (۱۴۵۹ - ۱۵۱۰ء) تاریخ گجرات کا ایک باب ہے۔ اس نے تین شہر تعمیر کئے۔ مصطفےٰ آباد (جوناگڑھ) محمود آباد (کھیڈہ) اور محمد آباد (چانپانیر) آخرالذکر اس کو بہت پسند تھا اور وہ زیادہ تر وہیں رہتا تھا۔ اس وسیع اور خوبصورت شہر کا بڑا حصہ اب موجود نہیں لیکن پھر بھی جو عمارتیں اور آثار باقی ہیں اُن سے اس کی عظمت رفتہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چانپانیر کی سب سے نمایاں عمارت جامع مسجد ہے

جو سلطان بیگڑہ کی وفات سے صرف دو سال پہلے مکمل ہو گئی تھی ۔سلطان محمود کی مسجد (جاپانیر میں) اگرچہ خالص فن کے لحاظ سے احمد شاہ کی مسجد (احمد آباد میں) کے بعد آتی ہے لیکن زیب و زینت کے سلسلے میں جو کام کیا گیا ہے اس کی بدولت یہ عمارت اعلیٰ ترین آثار میں شامل کی گئی ہے ۔سلطان محمود کی مسجد، احمد شاہ کی مسجد سے چھوٹی ہے ۔اس کے کل رقبہ کا مستطیل دو سو ستر فٹ لمبا اور ایک سو اسّی فٹ چوڑا ہے ۔صحن کے چاروں طرف کے دالان صرف ایک گہرے ہیں ۔تینوں طرف اندر داخل ہونے کے لئے دروازے ہیں ۔مشرقی جانب یعنی عمارت کے سامنے کا دروازہ نہایت شاندار ہے اور درحقیقت وہ خود ایک عمارت ہے مسجد کے اندر سامنے کی دیوار میں پانچ در ہیں ۔بیچ کے در کے اوپر ادھر اُدھر نازک مینار ہیں یہ در بقیہ دروں سے زیادہ وسیع ہے ۔اندر کی عمارت دو سو ستر فٹ لمبی اور ایک سو تیس فٹ چوڑی ہے اور اس میں ایک سو چہتّر ستون ہیں ۔بنیادی طور پر یہ مسجد بھی احمد آباد کی جامع مسجد ہی کے طرز پر تیار کی گئی ہے ۔ان عمارتوں کے علاوہ گجرات میں اور بھی قدیم تعمیرات کے آثار موجود ہیں جو فن کے لحاظ سے دلچسپ اور قابل قدر ہیں ۔

مالوہ

مالوہ میں دو مقامات اپنی تعمیرات کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں ۔ماندو اور دھار مالوہ کی عمارتوں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا طرز تعمیر دہلی سے ملتا ہے ۔بعض عمارتیں تغلق عہد کی اور بعض سید و لودی عمارات کے نمونے پر تیار ہوئی ہیں ۔اس کے علاوہ تزئین عمارات کے سلسلہ میں مختلف رنگوں سے جو کام لیا گیا یعنی مختلف رنگوں کے پتھر اور ٹائلوں کا کثرت سے استعمال کر کے ان کی خوبصورتی بڑھانے کی کوشش بھی قابل ذکر ہے ۔اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ قرب و جوار کے علاقے سے مختلف رنگوں کے پتھر مل جاتے تھے ۔قلعہ بند شہروں میں ماندو کو سب سے زیادہ شاندار کہا جاسکتا ہے ۔وہ ایک مرتفع میدان پر واقع ہے جو تقریباً ایک ہزار فٹ بلند ہے اور جس کا سلسلہ وندھیا چل سے

مل جاتا ہے۔ چاروں طرف دس بڑے محراب دار دروازے ہیں جو ایسے مقامات پر بنائے گئے ہیں کہ شہر تک پہنچنے والے راستوں کی حفاظت ہو سکے۔

دلاور خان غوری (۱۴۰۱ – ۱۴۰۵ء) کا جو مالوہ کی خودمختار سلطنت کا بانی تھا پہلا دارالحکومت دھار میں تھا۔ یہاں کا قلعہ سلطان محمد بن تغلق کا بنوایا ہوا تھا۔ دلاور کو جلد ہی محسوس ہو گیا کہ یہ اس کے لئے دفاعی حیثیت سے ناقابل اطمینان ہے۔ لہٰذا اس نے اپنا دارالحکومت مانڈو کو بنایا۔ اس کی بنوائی ہوئی دو مسجدیں قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک مانڈو میں اور دوسری جس کو لاٹ مسجد بھی کہتے ہیں دھار میں ہے۔ دلاور خان کا بیٹا اور جانشین، ہوشنگ شاہ (۱۴۰۵ - ۱۴۳۵ء) درحقیقت مانڈو کا معمار کہا جا سکتا ہے۔ اس کے باپ نے نئے شہر کی دفاعی حالت کو قابل اطمینان بنانے کا فرض اسی کے سپرد کیا تھا۔ خوش قسمتی سے ہوشنگ تعمیرات سے دلچسپی رکھتا تھا جس کی زندہ شہادت ہم کو مانڈو کی شاندار جامع مسجد اور ہنڈولہ محل میں ملتی ہے۔ یہ عمارتیں، تغلقوں کی عمارات کے طرز پر بنائی گئی تھیں لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ ان سے کہیں زیادہ شاندار اور پروقار ہیں۔ ہنڈولہ محل ایک انگریزی حرف ٹی (T) کی شکل کی عمارت ہے۔ اس کی ساق محل کا دربار ہال ہے اور ایک کنارے پر دونوں طرف زنانہ کمرے ہیں جن میں کہیں کہیں جالی کی دیواریں بھی ہیں۔ ہنڈولہ محل کی لمبائی ایک سو ساٹھ فٹ ہے اور چوڑائی سو فٹ ہے۔ ہنڈولہ محل رہائش کی غرض سے بنایا گیا تھا نہ کہ دفاع کی، لیکن اس کی ساخت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بنانے والے کے ذہن میں دفاع کا خیال ضرور موجود تھا اور غالباً اس کا سبب یہ ہو گا کہ اس دور میں مالوہ پر مخالفین کے حملوں کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ جامع مسجد شرقاً غرباً دو سو اٹھاسی فٹ اور شمالاً جنوباً دو سو اڑسٹھ فٹ ہے۔ مشرقی جانب داخل ہونے کا دروازہ نہایت وسیع اور شاندار ہے بلکہ خود ایک چھوٹی سی گنبد دار عمارت ہے اور چڑھنے کے لئے سیڑھیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کا دروازہ

نہایت وسیع اور شاندار ہے بلکہ خود ایک چھوٹی سی گنبددار عمارت ہے جس میں چڑھنے کے لئے سیڑھیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ دروازہ اور سیڑھیوں کو شامل کرکے مسجد کی وسعت میں تقریباً سو فٹ کا اضافہ اور ہو جاتا ہے۔ جامع مسجد یہاں کی عمارتوں میں سب سے بڑی عمارت ہے۔ شمال اور جنوب کی طرف بھی دروازے ہیں لیکن وہ شرقی دروازے کے مقابلے میں چھوٹے ہیں۔ مسجد کی کرسی بلند ہونے کی وجہ سے سامنے کے رخ میں زمین کی سطح پر مسقف دالان یا کمرے بنا دیئے گئے ہیں جو لوگوں کے قیام کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں۔ صحن کے تین طرف یعنی قبلہ کے رخ کو چھوڑ کر مسقف دالان ہیں اور ان میں گیارہ گیارہ محراب دار در ہیں۔ ان دالانوں میں شمال اور جنوب کی طرف تین گہیں ہیں اور مشرق کی جانب دو اور خود قبلہ کی جانب اصل عمارت میں پانچ ہیں۔ اس عمارت پر تین بڑے اور نمایاں گنبد ہیں۔ لیکن ساری چھت پر چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں جن کی تعداد ایک سو اٹھاون ہے عمارت کے اندر کے حصے میں قطار در قطار محرابوں کی وجہ سے ایک خاص شان اور وقار کا ماحول ملتا ہے۔ جو ایک مقدس عمارت کے لئے نہایت مناسب ہے۔ قبلہ کی دیوار میں بعض محرابوں پر تزئین کی غرض سے کچھ کام بھی کیا گیا ہے۔ منبر کی وجہ سے اس محراب کی خوبی اور بڑھ گئی ہے۔ جامع مسجد کے سامنے اشرفی محل کی عمارتیں ہیں جو سلطان محمود اوّل (۱۴۳۶ - ۱۴۶۹ء) کے عہد میں تیار ہوئیں۔ ان میں ایک مدرسہ۔ ایک مقبرہ اور ایک مینار ہیں۔ بعض ماہرین فن کا خیال ہے کہ مدرسہ تیار ہونے کے بعد بانیانِ عمارت کو خیال آیا کہ صحن کی وسعت کو مرتفع کرکے مقبرہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ سلطان محمود نے ۱۴۴۳ء میں چتوڑ کے رانا پر فتح حاصل کی اور اس فتح کی یادگار کے طور پر ایک خوبصورت مینار بنوایا جو ایک سو پچاس فٹ اونچا تھا۔ اس میں سات منزلیں تھیں۔ اور اسی بنا پر ہفت منزل کہلاتا تھا۔ مانڈو کی ایک شاندار اور قابل ذکر عمارت جہاز محل ہے۔ اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا کہ وہ دو تالابوں کے کنارے واقع تھا۔

جہاز محل کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ ہوشنگ نے بنوایا یا سلطان محمود نے، گمان غالب یہی ہے کہ موخرالذکر کا کارنامہ ہے ۔ جہاز محل کی تین سو ساٹھ فٹ لمبی عمارت کا فور" تلاؤ" اور منجا" تلاؤ" کے کنارے پر بنائی گئی ہے۔ عمارت کی چوڑائی بچاس فٹ سے کچھ کم ہے۔ گویا لمبائی اور چوڑائی کے تناسب میں جہاز کے تناسب کا خیال رکھا گیا ہے۔ عمارت کے اندر ستونوں پر قائم شدہ کمرے اور وسیع غسل خانے ہیں درمیان میں گیلریاں بھی ہیں ۔ من حیث المجموع یہ عمارت نہایت وقیع اور شاندار ہوگی۔ مغل شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں اس کی وسیع پیمانہ پر مرمت کی گئی اور کچھ اضافہ بھی کیا گیا۔

گجرات اور مالوہ کی جن چند عمارتوں کے آثار کا مختصر ذکر کیا گیا ہے، ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان علاقوں نے فن تعمیر کی ترقی میں کس قدر نمایاں حصہ لیا ہے۔

دکن

سلطنت دہلی کے بعد فن تعمیر نے سب سے زیادہ ترقی دکن میں کی۔ منجملہ دیگر اسباب کے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دکنی سلطنتوں کی عمر بمقابلہ دوسری خود مختار حکومتوں کے بہت زیادہ تھی۔ تاریخی اور جغرافیائی حالات کے ماتحت دکن کے فن تعمیر پر دو طرف سے اثرات آئے۔ ایک دہلی سے اور دوسرے ایران سے ۔ مسلمانوں نے دکن کے علاقے کو چودہویں صدی کے شروع میں فتح کیا اور یقیناً شمالی علوم وفنوں کے اثرات اسی وقت سے دکن پہنچنے لگے ہوں گے لیکن سلطان محمد بن تغلق کے اس منصوبہ کی بدولت کہ دولت آباد کو سلطنت کا دوسرا دارالحکومت بنایا جائے بڑی کثرت سے اہل علم اور ماہرین فنون دہلی سے

دکن پہنچے۔ ابتدائی دور کی دکنی عمارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان آنے والوں میں فن تعمیر کے ماہر اور کاریگر وغیرہ بکثرت یہاں آگئے تھے۔ دکنی فن تعمیر پر دوسرا اثر ایران سے آیا۔ دکن کی پہلی خود مختار حکومت یعنی بہمنی سلطنت کا بانی، علاء الدین حسن ایرانی النسل ہی تھا۔ چنانچہ ابتداء ہی سے نئی سلطنت کے روابط ایران سے شروع ہوگئے۔ اس کے علاوہ بحری راستہ کے ذریعہ ایران سے آمد و رفت بغیر کسی رکاوٹ کے ہو سکتی تھی۔ تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ دکن کی خود مختار سلطنتوں کے حکمرانوں نے ایران سے سیاسی تعلقات ایک زمانہ میں اس حد تک بڑھالئے کہ وہ مغلیہ سلطنت کے مقابلہ میں خود کو ایران سے قریب تر سمجھتے تھے۔ یہ ہی سبب ہے کہ جس قدر زمانہ گذرتا چلا گیا، دکن کے علوم و فنون بلکہ زندگی کے ہر شعبہ پر ایرانی اثر زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔

گلبرگہ

بہمنی سلطنت کا پہلا دار الحکومت، گلبرگہ، دکن کے اکثر شہروں کی طرح دفاعی نقطہ نظر سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کے قلعے کا اب کوئی حصہ بیرونی دیوار اور مسجد کے علاوہ باقی نہیں۔ قلعہ کی مضبوطی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی دوہری دیواریں تیس فٹ موٹی ہیں اور چٹان کو کاٹ کر جو خندق بنائی گئی ہے وہ کہیں کہیں تیس گز چوڑی ہے۔ اس کا دروازہ بھی نہایت مضبوط ہے۔ قلعہ کی عمارتوں میں صرف ایک عمارت جو اس وقت باقی ہے، یعنی جامع مسجد، اپنی قسم کی مخصوص عمارت ہے وہ دو سو سولہ فٹ لمبی اور ایک سو چہتر فٹ چوڑی ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کا صحن مسقف ہے۔ قبلہ کی جانب چھوڑ کر تینوں طرف مسقف دالان ہیں۔ چونکہ صحن پر بھی اڑسٹھ چھوٹے گنبدوں کی چھت ہے اس لئے ساری عمارت ایک بڑا ہال معلوم ہوتی ہے جس کی چھت ستونوں پر رکی ہوئی ہے۔ اصل عمارت پر ایک بڑا گنبد ہے۔ دالانوں کی ساخت بھی دوسری مسجدوں

کے دالانوں سے مختلف ہے۔ ستونوں پر قائم کی ہوئی چھت کی بجائے ایک بڑی تعداد محراب دار دروں کی ہے۔ اس مسجد کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ صدر دروازہ جو عام طور پر مسجدوں میں شرقی جانب ہوتا ہے اس میں شمال کی جانب ہے

گلبرگہ کی ایک اور عمارت بھی قابل ذکر ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کا مزار مبارک دکن کی مشہور زیارت گاہ ہے۔ اس کے صدر دروازے پر جو محراب ہے وہ جامع مسجد ہی کی محرابوں کے طرز کی ہے یعنی زیادہ اونچی نہیں لیکن نہایت وسیع ہے۔ مزار کی عمارت کے علاوہ خود دروازہ بھی نہایت شاندار ہے۔

بیدر

۱۴۲۵ء میں سلطان احمد شاہ نے بہمنی سلطنت کا پایہ تخت گلبرگہ سے تبدیل کر کے بدر میں قائم کیا۔ اسی زمانہ سے بہمنیوں کے فن تعمیر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ بدر کا قلعہ ان ہی اصولوں پر بنایا گیا جن پر گلبرگہ کا قلعہ تعمیر ہوا تھا لیکن یہ اس کے مقابلہ میں بہت بڑا ہے اور اس کے اندر آثار بھی باقی ہیں جن سے اس کے نقشہ کا تصور قائم کیا جا سکتا ہے۔ ان آثار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایرانی فن تعمیر کا اثر ان عمارات پر کس قدر زیادہ تھا۔ بالخصوص شوخ رنگ کے نقش و نگار ہیں جو ایرانی طرز کی بڑی خصوصیت تھی۔ قلعہ کے علاوہ دو مسجدیں بھی قابل ذکر ہیں۔ ایک جامع مسجد اور دوسری سولہ کھمبہ کی مسجد۔ دونوں کا طرز وہی ہے جو گلبرگہ کی جامع مسجد کا ہے لیکن صحن مسقف نہیں ہیں۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مسجدوں کی عمارتیں شوخ نہیں بلکہ متین اور باوقار ہیں۔ بدر کی سب سے اہم عمارت، وزیر محمود گاواں کا مدرسہ ہے۔ محمود نے علم و ادب کو ترقی دینے کے لئے یہ مدرسہ بنوایا تھا، اس کو درحقیقت یونیورسٹی کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کیوں کہ تدریس کے کمروں کے علاوہ اس میں کتب خانہ، مسجد اور اساتذہ و طلبہ کے لئے قیام گاہ، غرضکہ تعلیمی ضروریات کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ یہ مدرسہ دو سو پانچ فٹ

لمبا اور ایک سو اسی فٹ چوڑا ہے۔ وسط میں ایک چوکور صحن ہے اور چاروں طرف کمرے اور دالان وغیرہ ہیں اس کی اصل عمارت تین منزلہ ہے اور اس کے دونوں کناروں پر دو اونچے مینار ہیں۔ عمارت کی زینت کے لئے مختلف رنگوں اور طرزوں کے ٹائل بکثرت استعمال کئے گئے ہیں۔ ان عمارتوں کے علاوہ بدر میں سلاطین بہمنی کے مقبرے بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ بارہ مقبرے ایک ہی طرز کے ہیں۔ ایک مربع عمارت جس کے چاروں جانب محراب دار دالان ہیں اور اصل عمارت پر ایک ہشت پہل "ڈرم" پر گنبد کی چھت۔ گنبد کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ اس میں "بُلبُس" (یعنی پیاز کی شکل کے) گنبد کی جو بعد میں اس قدر مقبول ہو گیا ابتدا نظر آتی ہے ایرانی اثر یہاں بھی ٹائلوں کے استعمال سے ظاہر ہوتا ہے۔ بہمنی سلطنت کے خاتمہ پر بریدشاہی حکومت کا مرکز بنا۔ چنانچہ بریدشاہی سلاطین کے مقبرے بھی قابل ذکر عمارتوں میں ہیں۔ علی برید کا مقبرہ سب سے بہتر ہے۔

گولکنڈہ

قطب شاہی سلاطینِ گولکنڈہ کی عمارتیں بھی فن تعمیر کے لحاظ سے اہم ہیں۔ یہ خاندان ۱۵۱۲ سے ۱۶۸۷ تک برسر اقتدار رہا۔ اس مدت میں ان سلاطین نے بہت سی عمارتیں بنوائیں۔ گولکنڈہ کا قلعہ دفاع کے لحاظ سے نہایت مضبوط تھا اور مغل، قطب شاہی جنگ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ قطب شاہی عمارتوں میں سات مقبرے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی مقبرے ہیں۔ مقبروں کا طرز تعمیر وہی ہے جو بدر کے مقبروں کا ہے لیکن عمارتوں کی زینت کے لئے نقش و نگار کے اضافہ سے اس کو ایک خصوصی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ گنبد اب پورے طور پر "بُلبُس" یعنی پیاز کی شکل کا ہو گیا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ ان گنبدوں کو دوہرا نہیں کہا جاسکتا لیکن ان کو بلند کرنے کے لئے ایک خمدار سقف قبر کے اوپر بنا دی گئی ہے۔ ان مقبروں میں عبداللہ قطب شاہ

(المتوفی ۱۶۷۲ء) کا مقبرہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے جس میں اوپر کی منزل میں ایک مختصر سا برآمدہ ہے۔ اس عہد کی اور عمارتوں میں کئی مسجدیں بھی قابل ذکر ہیں مثلاً حیدرآباد کی جامع مسجد، مکہ مسجد، مشیرآباد مسجد اور تولی مسجد، لیکن قطب شاہی دور کی وہ عمارت جس کو فن کے لحاظ سے اہم ترین عمارتوں میں شمار کیا گیا ہے چہار مینار ہے۔ یہ ایک مربع نما عمارت ہے جس کی لمبائی اور چوڑائی سو سو فٹ ہیں۔ چاروں کونوں پر مینار ہیں جن میں سے ہر ایک کی اونچائی ایک سو چھیاسی فٹ ہے۔ نیچے کی منزل میں چاروں طرف چھتیس فٹ چوڑے محرابی دروازے ہیں جن پر نیچی نیچی کئی منزلیں ہیں۔ چہار مینار کی کئی خصوصیات قابل ذکر ہیں مضبوطی کے باوجود وہ نازک عمارت ہے۔ اوپر کی نیچی نیچی منزلیں ایک خاص طرز کی ہیں جن میں کافی جدت نظر آتی ہے۔ اس کی تفاصیل پر غور کرنے سے اس کی خوبیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرز کی جو عمارتیں بعد میں بھی تیار ہوئیں ان میں یہ خوبی پیدا نہیں ہوئی جو چہار مینار میں ہے۔

بیجاپور

گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتیں ایک ہی زمانہ میں وجود میں آئیں اور ان کی عمریں بھی تقریباً برابر ہوئیں، کیوں کہ ایک ۱۶۸۶ء اور دوسری ۱۶۸۷ء میں مغلیہ سلطنت میں شامل کرلی گئیں۔ دونوں خاندانوں کے حکمران علوم و فنون کی سرپرستی کرتے تھے لیکن دونوں میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ سلاطین بیجاپور فن تعمیر کے بہت دلدادہ تھے اور یہی سبب ہے کہ اگرچہ بیجاپور مقابلتہً چھوٹی جگہ ہے لیکن وہاں قدیم عمارتیں اور ان کے آثار بکثرت ہیں اور ان میں سے بعض نہایت اہم اور قابل قدر ہیں۔ یہاں تقریباً پچاس مسجدیں اور چالیس مقبرے اور محلات کے علاوہ دو مسجدیں بھی تھیں۔ بعد میں اس کے چاروں طرف اور عمارتیں بنتی گئیں۔ اور بالآخر ۱۵۶۵ء میں ایک مضبوط حصاری دیوار بن کر تیار ہوگئی۔ یہاں چند عمارتوں کا مختصر

ذکر کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلی قابل ذکر عمارت جامع مسجد ہے جو علی عادل شاہ اول (۱۵۵۸ تا ۱۵۸۰ء) کے عہد میں تیار ہوئی۔ یہ عمارت مکمل نہ ہوسکی اور شرقی جانب جو مینار بننے والے تھے وہ نہ بن سکے۔ داخل ہونے کا دروازہ عالمگیر نے شہر کو فتح کرنے کے بعد بنوایا یہ مسجد ایک وسیع عمارت ہے اور اس کا کل رقبہ ساڑھے چار سو فٹ لمبا اور سوا دو فٹ چوڑا ہے۔ صحن ایک سو پچپن فٹ لمبا اور اسی قدر چوڑا ہے۔ اس کے تین جانب سات سات محرابی در ہیں۔ اصل عمارت کے وسط میں چھت پر گنبد ہے جو گلبرکہ کی قلعہ والی جامع مسجد کے گنبد سے مشابہ ہے لیکن دونوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ ایک ابتدائی کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور دوسرا ترقی یافتہ دور کی شہادت دیتا ہے۔ اس کے علاوہ عادلشاہی گنبد کہیں زیادہ خوشنما ہے۔ اصل عمارت کو ایک ہال کہا جاسکتا ہے جس کی لمبائی دو سو آٹھ فٹ اور چوڑائی ایک سو سات فٹ ہے۔ یہ پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں بیچ کا حصہ چہتر فٹ مربع ہے۔ اس کے ہر چہار جانب تین تین محرابی در ہیں۔ من حیث المجموع یہ مسجد ایک سادہ مگر باوقار عمارت کہی جاسکتی ہے۔ دوسری قابل ذکر تعمیر ابراہیم کا روضہ ہے۔ یہ خود ابراہیم عادل شاہ اول (۱۵۸۰۔۱۶۲۷ء) کے حکم پر اس کے مقبرہ کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مسجد بھی ہے۔ فن کے لحاظ سے اس عمارت کو بہت اعلیٰ خیال کیا جاتا ہے۔ روضہ کی عمارتیں نہایت احتیاط سے بنائی گئی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بھی اچھی طرح سے غور کیا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ تیار کی گئی ہیں بعض ماہرین کا قول ہے کہ ایک پتھر بھی ان عمارتوں میں بغیر سوچے ہوئے نہیں لگایا گیا ہے۔ مقبرہ اور مسجد کے درمیان جو جگہ ہے اس میں تالاب اور فوارہ بنایا گیا ہے جس سے عمارتوں کا حسن دوبالا ہوگیا ہے۔ مقبرہ کی اصل عمارت کے چاروں طرف برآمدہ ہے اور چھت پر گنبد ہے۔ برآمدہ کے محرابی دروں میں ہر جانب دو دروں کی چوڑائی بقیہ کے مقابلہ میں کم ہے۔ ہر کونے پر ایک مینار کی عمدہ اور خوبصورت منارہ

ہے لیکن سب سے زیادہ قابل تعریف اوپر کی منزل ہے جس کو بریکٹوں اور دندانوں سے خوبصورت بنایا گیا ہے۔ اوپر کی اس منزل پر ایک خمدار چھت اسی طرز کی بنائی گئی ہے جیسی کہ عبداللہ قطب شاہ کے مقبرہ پر گولکنڈہ میں ہے۔ فن کے لحاظ سے یہ چھت بنانے والوں کے کمال کا بہترین مظاہرہ ہے۔

علی عادل شاہ کے جانشین، محمد عادل شاہ (۱۶۲۷۔۱۶۵۷ء) کے عہد کی سب سے مشہور عمارت یا عمارتوں کا مجموعہ گول گنبد کہلاتا ہے۔ اس کی خاص خاص عمارتیں یہ ہیں مقبرہ، مسجد، نقار خانہ اور دھرم سالہ۔ یہ سب عمارتیں ایک چہار دیواری کے اندر ہیں۔ اندر کی عمارت میں ایک بڑا کمرہ ہے جس پر الٹے ہوئے پیالے کی شکل کا گول گنبد ہے۔ وسعت کے لحاظ سے اس کا شمار اباسوفیہ (استنبول)، یا پینتھون (روما) کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ رقبہ میں یہ پینتھون سے بھی زیادہ ہے اور شاید دنیا کی سب سے وسیع ایک گنبد والی عمارت ہے۔ اس کی محرابیں بلند ہیں اور چھت پر گنبد باوجود وسعت کے اکہرا ہے۔ اس کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ نیچے سے مربع عمارت کو اوپر لے جاتے ہوئے گولائی کی شکل دے دی گئی ہے تاکہ گنبد کے مطابق ہو جائے۔ وسعت اور بعض دیگر خصوصیات کے لحاظ سے بیجاپور کی متعدد عمارتوں میں سے ایک کا ذکر اور کیا جا سکتا ہے۔ بہتر محل، حقیقتاً کوئی محل نہیں بلکہ ایک شاندار مسجد کا عظیم الشان دروازہ ہے۔ لیکن وہ صرف دروازہ ہی نہیں۔ کیوں کہ اس کی بالائی منزل پر ایک بہت بڑا کمرہ ہے جو موجودہ دور کی ضروریات کے لحاظ سے بھی ایک عمدہ ہال کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ سامنے کی طرف دونوں کونوں پر مینار ہیں اور ایک بڑی کھڑکی ہے جس کی کارنس نہایت خوبصورت ہے۔ ساری عمارت پر نہایت عمدہ کام ہو رہا ہے جس نے اس کو دیدہ زیب بنا دیا ہے۔

خود مختار سلطنتوں کی عمریں ماسوا چند کے بہت زیادہ نہیں ہوئیں لیکن اس کے باوجود تعمیرات کی شکل میں انہوں نے اپنے کارناموں کی جو یادگاریں چھوڑی ہیں

ان کی وسعت اور خوبی کا کچھ اندازہ ان خصوصیات سے لگایا جاسکتا ہے جن کا ذکر ان چند صفحات میں کیا گیا ہے۔ یہاں یہ ممکن نہیں تھا کہ عمارات سے متعلق زیادہ تفصیلات بیان کی جاتیں۔ لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی بنا پر تصویر کا ایک خاکہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

شیر شاہ کی عمارات

سلاطین دہلی کے آخری خاندان اور شیر شاہ کے درمیان پندرہ سال کا فصل ہے، اس زمانہ میں دو مغل حکمران برسر اقتدار رہے، لیکن ثقافتی اور دوسری روایات کے لحاظ سے یہی مناسب ہوگا کہ شیر شاہ کی عمارات کا ذکر یہاں کر دیا جائے، بابر اور ہمایوں کا ذکر ان کے جانشینوں کے ساتھ کیا جائے گا۔

شیر شاہ کی بادشاہی سے پہلے تقریباً پندرہ سال تک دو مغل بادشاہ یعنی بابر اور ہمایوں حکومت کر چکے تھے۔ لیکن کئی لحاظ سے شیر شاہ کے مختصر عہد حکومت کو افغان اور مغل حکومتوں کے درمیان عبوری دور کہا جاسکتا ہے۔ تعمیرات کے لحاظ سے بھی یہ غلط نہیں ہوگا۔ اس کی عمارتوں کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ جبکہ اس کو مشرقی علاقوں میں اقتدار حاصل تھا اور دوسرا جب وہ مغلیہ حکومت کے تخت و تاج کا مالک بنا۔ پہلے دور کی عمارتیں، سہسرام یعنی شیر شاہ کے وطن میں ہیں۔ ان میں کئی مقبرے ہیں اور یہ سب شیر شاہ کی حکومت سے پہلے بنائے گئے تھے۔ یہاں شیر شاہ کے والد حسن خاں کے مقبرے کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ یہ مقبرہ لودیوں کے مقبروں کی طرح ہشت پہل عمارت ہے۔ اس میں بعض نقائص ہیں مثلاً اس کی کرسی اونچی نہیں، حقیقت یہ ہے کہ عمارت سطح زمین کے برابر ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس سے عمارت

کی شان میں نمایاں کمی پیدا ہو گئی ہے۔ اس قسم کے نقائص کا سبب بظاہر یہ تھا کہ یہ اس علاقہ کی ابتدائی کوشش تھی اور اس کو تجربہ کی کوشش کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد چند سال میں جو غیر معمولی سیاسی انقلاب رونما ہوا اور جس نے حکومت واقتدار کی گدی پر شیر شاہ کو بٹھلایا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ فن تعمیر بھی ترقی کرے۔ یہی سبب ہے کہ خود شیر شاہ کا مقبرہ اپنی فنی خوبیوں کی بدولت دنیا کی اعلیٰ ترین عمارتوں میں شمار کیا گیا ہے۔ شیر شاہ کا مقبرہ لودیوں کے مقبروں کے نمونے ہی پر بنا ہے لیکن وہ ان سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ وہ ایک بہت بڑے تالاب کے بیچ میں بنایا گیا اور اس کا چبوترہ چاروں طرف چودہ سو فٹ لمبا ہے۔ خود عمارت دو سو فٹ مربع ہے اور ایک سو فٹ اونچی ہے۔ شمال کی طرف ایک راستہ ہے جو اس عمارت کو تالاب کے کنارے سے ملاتا ہے۔ اس پنج منزلہ عمارت کی پہلی دو منزلیں مربع ہیں۔ ایک تو پانی میں ہے۔ دوسری منزل کی چھت ایک وسیع صحن ہے جس کے چاروں کونوں پر ہال کی طرح کمرے ہیں اس صحن میں مقبرہ کی اصل عمارت ہے جو ہشت پہلو ہے اس میں تین منزلیں ہیں۔ ان پر ایک وسیع گنبد جس کو زیادہ اونچا نہیں کیا جا سکتا مقبرہ کی عمارت اندر سے چھیاسٹھ فٹ لمبی اور اسی قدر چوڑی ہے۔ اونچائی نوے فٹ ہے قبلہ کی جانب کے علاوہ ہر طرف دروازہ ہے۔ ماہرین فن نے اس عمارت میں ایک سقم بتلایا ہے یعنی کرسی والی منزل اور اس کے اوپر کی منزل کے رخوں میں آٹھ درجہ کا فرق ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقص بنانے والوں نے معلوم کر لیا تھا اور نہایت کاریگری سے اس کو دور کیا ہے۔ چنانچہ اس عمارت کی مجموعی حیثیت اور خوبی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔ شیر شاہ کا مقبرہ ان چند مشہور مقبروں میں سے ہے جن کو دیکھ کر کوئی شخص بھی بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔

بادشاہ ہونے کے بعد شیر شاہ کی دلچسپیاں ظاہر ہے کہ دہلی و آگرہ کے علاقوں سے متعلق ہو گئیں اور اس دور میں اس کے ذوق تعمیرات کی یادگاریں ہم کو وہیں

ملتی ہیں۔ ان کے حالات اور کیفیت یہ ہی مناسب ہو گا کہ مغلیہ دور کی عمارتوں کے ساتھ لکھے جائیں۔

مغلیہ عہد

دہلی وعلاقائی عہد سلطنت کی تعمیرات کے متعلق پچھلے باب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے اس فن کی ترقی کی صرف دھندلی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے لیکن پھر بھی ان ہی کی بنیاد پر ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زندگی کے دوسرے اہم شعبوں کی طرح اس فن میں بھی ہمارے اجداد کے کارنامے مایہ ناز وافتخار کہے جا سکتے ہیں اس کے بعد جو دور آتا ہے یعنی مغلیہ حکومت کا عہد شباب، اس میں ہند پاکستانی تہذیب اپنے اوج کمال پر پہنچی، برصغیر میں زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر مغلیہ عہد کے گہرے اور بعض حالات میں غیر فانی اثرات نہ چھوڑے ہوں۔ امتداد زمانہ سے ان میں تبدیلیاں ضرور ہوئیں لیکن ہند پاکستانی مسلمانوں کے کارنامے تہذیب وتمدن کی تاریخ میں دائمی حیثیت اور بلند مقام حاصل کر چکے ہیں۔ مغلوں کی کتنی عمارتیں ہیں جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تکمیل کو پہنچی ہیں۔ آج بھی بھارت اور پاکستان کے لوگ اس شاندار ورثہ پر فخر کرتے ہیں۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ تاریخ میں بہت کم حکمران خاندان ایسے ملیں گے جن کی چند نسلوں تک متواتر ایسی عظیم شخصیتیں صاحب تاج وتخت ہوتی رہی ہوں جیسی کہ مغلیہ خاندان میں بابر سے عالمگیر تک ہوئیں۔ ان میں سے ہر ایک علم پرور، ادب نواز، اور ہنر کا قدردان تھا۔ یہ ایک

تاریخی حقیقت ہے کہ ان شہنشاہوں کی خوش ذوقی، علوم و فنون کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ تھی۔ شاہجہان کی عمارتیں تو دنیا کی بہترین تعمیرات میں شامل ہیں ہی، لیکن باقی پانچ بادشاہوں میں بھی ایسا کوئی نہ تھا جس نے کوئی نہ کوئی قابل ذکر عمارت نہ بنوائی ہو۔ مغلیہ دور کی تعمیرات کے مطالعہ سے دو نتیجے تو یقیناً نکالے جاسکتے ہیں۔ ایک تو یہ بات ظاہر ہے کہ دولت کی فراوانی اور ملک کی خوشحالی ہی کی صورت میں کوئی حکمران اتنے وسیع پیمانہ پر عمارات کا سلسلہ شروع کر سکتا ہے، دوسرے یہ کہ اہل فن، صناع اور عام مزدوروں کے لئے ان عمارتوں کی تعمیر سے کام مہیا ہوتا رہتا تھا اور بے روزگاری کا یہ نہایت عمدہ علاج تھا، یہی سبب ہے کہ اس زمانہ میں یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

بابر و ہمایوں کا دور ۱۵۲۶-۱۵۵۶ء

توزک بابری کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی نظر میں برصغیر کی بہت سی چیزیں اس معیار کی نہ تھیں جو خود اس کے آبائی وطن کے لوگوں نے قائم کیا تھا، یہاں کی عمارتوں سے بھی بالعموم وہ مطمئن نہ تھا۔ غالباً منجملہ اور اسباب کے اس کے دو سبب یہ بھی تھے کہ جو مقامات اس نے دیکھے ان میں صرف آگرہ، لاہور اور چند چھوٹے شہر ہی تھے جہاں قابل ذکر اور تاریخی عمارتیں موجود تھیں۔ ان کی حالت یا کم از کم ان عمارات کی جو آباد نہ تھیں خستہ اور مرمت طلب تھیں۔ مثلاً دہلی میں فیروز شاہ کے کوٹلہ میں بہت سی عمارتیں شکستہ ہو چکی تھیں اور ۱۵۲۶ء میں دیکھ کر ان کی اس شان کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا جو ڈیڑھ سو سال پہلے تھی۔ علاوہ ازیں بابر کی فتح سے پہلے ایک زبردست زلزلہ نے عمارتوں کو شدید نقصان پہنچایا تھا یہ ایسا خوفناک زلزلہ تھا کہ بقول صاحب تاریخ خانجہان لودی، بڑی بڑی عمارتیں تباہ ہوگئی تھیں اور جو لوگ

اس وقت زندہ تھے وہ خیال کرتے تھے کہ قیامت آگئی ہے اور جو مردہ تھے ان کے لئے وہ روزِ حشر تھا۔ لہٰذا بابر کی آمد کے وقت بہت سی عمارتیں خراب اور شکستہ حالت میں تھیں۔ بابر یہاں کے کاریگروں اور صناعوں کی تو تعریف کرتا ہے لیکن عمارتوں کے طرز پر اس نے بعض اعتراض کئے ہیں۔ بہرحال اس نے اپنے مختصر عہدِ حکومت میں تعمیرات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور بقول اس کے چھ سو اسی آدمی آگرے میں کام کرتے تھے۔ ان کے علاوہ مختلف مقامات پر چودہ سو اسّی سنگتراش تھے۔ بابر کی ان عمارتوں میں جو اس وقت تک باقی ہیں چند مسجدیں ہیں۔ پانی پت اور سنبھل کی مسجدیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ بابر کی ان مسجدوں میں فن کے لحاظ سے کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہو۔ بعض مورخوں نے ذکر کیا ہے کہ بابر نے یہ کوشش کی کہ قسطنطنیہ سے مشہور ماہر فن سنان کے شاگردوں کو بلائے تاکہ وہ اس کو عمارتوں کی تعمیر کے سلسلہ میں مشورہ دیں۔ لیکن شاید یہ منصوبہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ مسجدوں کے علاوہ بابر نے کچھ قلعوں کی بھی مرمت کرائی اور ان کی توسیع بھی کی گئی۔

ہمایوں کو اپنے عہدِ حکومت میں باغی امراء، احسان ناشناس بھائی اور دو طاقتور حکمرانوں یعنی شیر خان سوری اور بہادر شاہ سے متواتر لڑنا پڑا۔ ان حالات میں وہ زیادہ عمارتیں نہیں بنوا سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے ذوق کی کچھ یادگاریں ضرور ہیں تخت نشینی کے بعد جلد ہی اس نے ایک نئے دارالحکومت کی بنیاد رکھی اور اس کو دین پناہ کا نام دیا۔ اس کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت بقول خواندمیر علماء، مشائخ، سادات اور دوسرے عمائدین سلطنت بادشاہ کے ساتھ موجود تھے۔ پہلی اینٹ تو خود بادشاہ نے رکھی، اس کے بعد سب نے ایک ایک اینٹ رکھی۔ ہمایوں نے تعمیر کے کام میں غیر معمولی جلدی کی اور ایک سال ختم ہونے سے پہلے شہر کی دیوار اور دروازے مکمل ہو گئے۔ اتنی عجلت میں تیار کی ہوئی عمارت زیادہ

دیرپا تو ہو ہی نہیں سکتی تھی لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ شیر شاہ کی حکومت میں اس کی شکستگی اور بربادی کی رفتار بہت زیادہ تیز ہو گئی ہوگی۔ بہرحال دین پناہ کے آثار اب بہت کم باقی ہیں، ہمایوں کے عہد کی دو مسجدیں بھی موجود ہیں، ایک آگرہ میں اور دوسری فتح آباد میں، لیکن یہ نہایت سادہ عمارتیں ہیں، اس عہد کی دو اور عمارتوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جمالی مسجد اور عیسیٰ خان کا مقبرہ۔ یہ دونوں عمارتیں دہلی میں ہیں اور علی الترتیب ۱۵۳۰ء اور ۱۵۴۷ء میں تیار ہوئی تھیں۔ ان دونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت سیّد اور لودیوں کے طرز کا اثر ابھی باقی تھا۔ اس مسجد میں پانچ محرابی در ہیں، بیچ کی محراب زیادہ بڑی اور دوہری ہے، اندرونی عمارت میں بھی پانچ حصّے ہیں۔ عیسیٰ خان کا مقبرہ ایک ہشت پہل عمارت ہے اور اس کی وسیع چہار دیواری بھی ہشت پہل ہے اس کے بیس سال بعد کی ایک اور عمارت یعنی ادھم خان کا مقبرہ اس لئے قابل ذکر ہے کہ وہ اس خاص طرز کا آخری نمونہ ہے جو اس وقت تک موجود ہے۔

شیر شاہ اور لودیوں کے دوسرے مقبروں کا ذکر جو سہسرام میں ہیں پہلے کیا جا چکا ہے۔ دہلی میں شیر شاہ نے دین پناہ کی بچی ہوئی عمارات کو صاف کر کے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی لیکن وہ اپنے مختصر عہد حکومت (۱۵۴۰-۱۵۴۵ء) میں اس کو مکمل نہ کرا سکا۔ ایک افغان مورخ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"دیگر شہر دارالخلافۂ دہلی کہ از آب جمن دور بود ویران ساختہ برکنارہ آب جمن آبادان ساخت و حکم فرمود کہ یک قلعہ و یک مسجد باستواری چوں کوہ و در بلندی برتر از ثریا وران شہر راست کنند، محل حاکم نشین و مسجد جامع کہ زر و لاجورد و شنگرف در نقاشی آن بسیار خرج شدہ است ساخت و آن قلعہ کہ در شہر بنا کردہ بود ہنوز باتمام نہ رسیدہ بود کہ از عالم فانی بہ سوئے جاودانی رحلت فرمود[1]"

---

[1] ضمیمہ تاریخ داؤدی (علیگڈھ - ۱۹۵۴) ص ۲۱۷

شیر شاہ کا یہ نامکمل حصار جس کو اب پرانا قلعہ کہا جاتا ہے، آج بھی مشہور قدیم عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ قلعہ کی جامع مسجد جو اسی طرز پر تیار ہوئی ہے جس پر جمالی مسجد ہوئی تھی۔ تقریباً پندرہ سال پہلے بنی تھی، لیکن یہ اس سے بہت بہتر اور اعلیٰ ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ شیر شاہ نے غالباً خود اس کی نگرانی کی ہوگی۔ شہر میں ایک ہشت پہل حوض ہے۔ اور ایک طرف بادشاہ کے لئے خاص دروازہ ہے۔ مسجد کی لمبائی ایک سو اڑسٹھ فٹ، چوڑائی ساڑھے چوالیس فٹ اور اونچائی چھیاسٹھ فٹ ہے۔ مسجد کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی سامنے کی دیوار ہے، جس کے پانچ حصوں میں دوہرے محرابی در ہیں۔ ان کو زینت دینے کے لئے سنگ مرمر سے کام لیا گیا ہے اور اس خوبی سے یہ سب کچھ کیا گیا ہے کہ بڑے سے بڑا نقاد کوئی اعتراض نہیں کرسکتا۔ عمارت کے اندر پانچ حصے ہیں اور قبلہ کی طرف جو محراب ہے وہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ محرابیں ہند پاکستان میں بہترین محرابیں سمجھی جاتی ہیں۔ بیچ کے حصہ پر گنبد ہے۔

شیر شاہ کے جانشین اس قابل نہ تھے کہ اس کے بلند معیار کو کسی شعبہ میں بھی قائم رکھ سکتے۔ جس طرح اس کے بعد انتظامی اصلاحات کا سلسلہ اکبر کے زمانہ تک منقطع رہا اسی طرح فن تعمیر کی ترقی بھی رکی رہی۔ اس کے جانشین سلیم شاہ کی یادگار یعنی قلعہ سلیم گڑھ جو دریائے جمنا کے کنارے پر واقع ہے اور اب شاہجہان کے لال قلعہ کا بیرونی حصہ سمجھا جاتا ہے کسی حیثیت سے بھی قابل ذکر نہیں۔ شیر شاہ کی وفات کے پندرہ سال بعد کی دو عمارتوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اتفاق سے یہ دونوں عورتوں کی بنوائی ہوئی عمارتیں ہیں۔ ماہم انگہ جس نے اکبر کو دودھ پلایا تھا بیرم خان کے معزول ہونے کے بعد بادشاہ اور سلطنت کے معاملات میں بڑی حد تک دخیل ہوگئی۔ اس نے اپنے دور اقتدار میں ایک مسجد اور مدرسہ تیار کرایا جس کا تاریخی نام خیر المنازل تھا اور اسی نام سے وہ مشہور ہوا[1]۔ دوسری عمارت عرب سرائے ہے جو ہمایوں بادشاہ کی بیوی حاجی بیگم کی

---

[1] سید احمد خان نے آثار الصنادید میں کتبہ نقل کیا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بنوائی ہوئی ہے۔ خیرالمنازل کی بالائی منزل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ لڑکیوں کے لئے تھا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اس کے صحن کی چہار دیواری کافی بلند ہے۔ مدرسہ کی عمارت اب شکستہ ہے لیکن اس کا شاندار دروازہ اچھی حالت میں ہے۔ عرب سرائے بھی فن تعمیر کے لحاظ سے قابل ذکر عمارت نہیں۔ اس کا یہ نام اس لئے ہوا کہ حاجی بیگم نے یہاں بہت سے عرب خاندانوں کو آباد کیا تھا[ل]۔

اکبری دور کی عمارتیں ۱۵۵۶ - ۱۶۰۵ء

ابتدائی عہد

ہمایوں کا مقبرہ

اکبر کے عہد میں فن تعمیر نے نمایاں ترقی کی۔ اس میں شک نہیں کہ اکبری عہد کی مشہور عمارتیں زیادہ تر فتحپور سیکری میں ہیں۔ لیکن ان سے پہلے بھی کئی مشہور عمارتیں بن چکی تھیں جو اپنی خصوصیات کی بناء پر خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کا مزار، گوالیار میں ہے۔ یہ ۱۵۶۴ء یا اسی کے قریب تیار ہوا۔ اپنی چند خصوصیات کی بناء پر وہ مشہور عمارتوں میں شمار کیا گیا ہے۔ بالخصوص اس کی پتھر کی جالیاں قابل دید ہیں اور فن کے لحاظ سے اس عہد کا کارنامہ کہی جاسکتی ہیں۔ اکبر کے ابتدائی دور کا شاہ کار، ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ یہ عمارت فن تعمیر کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے فن میں نئی روایات

(بقیہ پچھلے صفحہ کا)

رہے خیریت ایں بقعۂ خیر کہ شد تاریخ او خیر المنازل
(۹۴۸ھ)

ل۔ آثار الصنادید۔ ص ۳۲

نئے طرز اور نئی تفصیلات کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمایوں کا مقبرہ اس کی عزیز بیوی حاجی بیگم کا بنوایا ہوا ہے۔ حاجی بیگم کو بہ سلسلہ جلا وطنی باہر رہنے کا موقع ملا تھا۔ اس لئے یہ تعجب کی بات نہیں کہ اس عمارت میں ہم کو بیرونی اثرات صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلی قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اب مقبروں کی عمارت ایک وسیع باغ کے بیچ میں بنائی جانے لگی۔ مغلوں سے پہلے بھی ہم کو ایسے مقبرے ملتے ہیں جن کی عمارتیں چہار دیواری کے اندر رہیں، لیکن یہ مغلوں کی جدت ہے کہ مقبروں کو باغ کے وسط میں جگہ دی جانے لگی۔ دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بیرونی دروازے بہت شاندار ہونے لگے اور بعض بعض عمارتوں کے دروازے تو خود چھوٹی سی عمارت معلوم ہوتے ہیں۔ مقبرے کی عمارت ایک سو چھپن فٹ مربع ہے اور وہ خود ایک چوکور وسیع چبوترے پر قائم ہے۔ اس چبوترے کے چاروں طرف کی دیواروں میں محرابی در ہیں جو نظر کو خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ اندرون عمارت وسط میں ایک بڑا ہال ہے، اس کے چاروں طرف کمرے ہیں جن میں ایک سے دوسرے میں جانے کے لئے گیلریاں اور راستے ہیں۔ مشرقی دیوار کے وسط میں ایک چھوٹا سا دالان ہے جس کے بیچ میں دریا کی جانب ایک دروازہ ہے ۱۸۲۵ء میں بشپ ہیبر اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے :-

"اس وقت تک ایک نہر جاری تھی جس سے رعایا کچھ کاشت کرتی تھی"۔

دروازے میں جو سنگ خارا سے بنے ہیں سنگ سُرخ اور سنگ مرمر کا کام ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے مقبرہ کا گنبد سب سے زیادہ نمایاں حصہ ہے۔ یہ کسی بیرونی گنبد کی نقل تو نہیں کہی جا سکتی لیکن سمرقند و بخارا کے مشہور گنبدوں کی جھلک اس میں ضرور نظر آتی ہے۔ تاریخی حیثیت سے بھی ہمایوں کا مقبرہ بہت اہم عمارت ہے۔ مغلیہ خاندان کے متعدد شہزادے اور شہزادیاں یہاں دفن ہوئیں۔ لیکن اس کی سب سے بڑی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آخری مغل بادشاہ یعنی بہادر شاہ ظفر نے

اپنی شکست کے بعد یہیں پناہ لی اور اسی عمارت میں انہوں نے ایک انگریز افسر کے سامنے ہتھیار ڈال کر خود کو گرفتار کرا دیا۔

آگرے اور لاہور کے قلعے خود اکبر کی بنوائی ہوئی ابتدائی بڑی عمارتوں میں آگرہ و لاہور کے قلعے ہیں۔ آگرہ کا قلعہ ۱۵۶۶ء میں تیار ہوا' یہ نہایت مضبوط، سنگین اور وسیع عمارت ہے۔ دیواروں کی اونچائی ستر فٹ ہے اور پوری دیوار کے چاروں طرف ناپی جائے تو تقریباً ڈیڑھ میل ہوتی ہے یا صدر دروازہ جو دہلی دروازہ کہلاتا ہے اپنی شان اور وسعت کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ ابتدا میں اس دروازے پر دو پتھر کے ہاتھی بنے ہوئے تھے' اسی لئے اس کو ہاتھی پول بھی کہا جاتا ہے۔ قلعہ کے اندر بہت سی عمارتیں تھیں جن کی تعداد بقول ابوالفضل پانچ سو تھی۔ ان میں سے اب بہت کم باقی ہیں' سب سے قدیم قابل ذکر عمارت اکبری محل کہلاتی ہے۔ بعد میں اسی کے قریب شہزادہ سلیم کے لئے محل بنایا گیا جو جہانگیری محل کہلایا۔ دونوں محل ایک ہی طرز کے بنے ہیں' ان میں صحن کھلا ہوا ہے اور اس کے چاروں طرف دو منزلہ کمرے ہیں۔ دونوں عمارتیں سرخ پتھر کی ہیں جس پر کام کیا گیا ہے کہیں کہیں سنگ مرمر بھی استعمال ہوا ہے۔ ان میں محرابیں کم ہیں۔ ان کی جگہ بریکٹوں اور لنٹل (سردل) سے کام لیا گیا ہے۔ آگرہ کے قلعہ کے بعد لاہور کا قلعہ تیار ہوا جو فن کے لحاظ سے اول الذکر سے بہتر ہے۔ لیکن اس میں تبدیلیاں آگرہ کے قلعہ سے بھی زیادہ ہوئیں' اور سکھوں کے عہد میں بعض بدنما عمارتوں کے اضافے نے اس کی مجموعی خوبصورتی پر برا اثر ڈالا۔ ہاتھیوں شیروں اور موروں کی تصاویر کے بکثرت استعمال سے اندازہ ہوتا ہے کہ معماروں میں اور کاریگروں میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی۔ اکبر کا بنوایا ہوا تیسرا قلعہ الہ آباد کا ہے' اس میں بھی قدیم عمارتیں بہت کم ہیں۔ ایک شہ نشین جس کو زنانہ محل کہا جاتا ہے باقی ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ستون دوہرے ہیں اور زیادہ بھی ہیں۔

فتحپور سیکری

اکبر کی بہترین عمارتیں فتحپور سیکری میں ہیں جو اس کا محبوب دارالحکومت تھا۔ فتحپور سیکری میں اکبر کا قیام شیخ سلیم چشتیؒ کی وجہ سے تھا۔ کیوں کہ ان ہی کی دعاؤں کے بعد اس کا بیٹا سلیم پیدا ہوا اور زندہ رہا۔ فتحپور سیکری کی عمارتیں بہت جلد تیار ہوئیں اور بقول جہانگیر وہ پہاڑی جو جنگلی جانوروں کا مسکن تھی چودہ پندرہ سال میں ایک خوبصورت شہر بن گئی، جس میں دلکش باغ، عمارتیں اور محلات نظر آنے لگے۔ عمارتیں سنگ سرخ کی ہیں اس لئے کہ یہ پتھر بکثرت قریب ہی مل سکتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ تعمیر کے کام میں زیادہ دیر نہ لگی۔ یہ پہاڑی شمال مشرقی اور جنوب مغربی رخ کی ہے۔ اسی پر ایک مستطیل قطعہ جو دو میل لمبا اور تقریباً اس کے نصف چوڑا تھا۔ منتخب کر لیا گیا۔ اس کے تین طرف دیواریں بنائی گئیں اور چوتھی طرف بہت بڑا تالاب تھا۔ دیواروں میں نو دروازے تھے جن میں آگرہ کی جانب کا دروازہ عام طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس چہار دیواری کے اندر متعدد عمارتیں ہیں، جو محلات شاہی، امراء کے مکانات اور دفاتر وغیرہ پر مشتمل ہیں لیکن سب سے زیادہ نمایاں اور قابل تعریف عمارت جامع مسجد کی ہے محلات میں سب سے اہم اور غالباً سب سے پہلی عمارت جودھ بائی کا محل ہے۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے جس کی دیوار باہر سے بالکل سادہ ہے، دروازہ مشرقی جانب ہے اور نہایت شاندار ہے۔ بیچ میں محرابی دروازہ ہے اور ادھر اُدھر دو محرابی در ہیں، جن پر چھجہ دار کھڑکیاں ہیں۔ اندرون عمارت بڑے بڑے کمرے، دالان اور راستے ہیں۔ پتھر میں جو کام ہو رہا ہے اس کی تفصیل پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ گجرات اور راجپوتانہ کے مندروں کی خصوصیات اس میں ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ جودھا بائی کے محل کے علاوہ اکبر کی دو اور بیویوں، یعنی مریم مکانی اور رومی سلطانہ کے محل بھی قابل ذکر ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں یہ بہت چھوٹے اور کم اہم ہیں۔

جامع مسجد

تعمیرات فتحپور سیکری کا شاہکار، جامع مسجد ہے جس کا شمار اُن عمارتوں میں ہوتا ہے جن کو دیکھنے کی غرض سے دور دراز مقامات کے سیاح آتے ہیں۔ وہ اپنی خصوصیات کی بدولت مغل فن تعمیر کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ مسجد کی مستطیل چہار دیواری شرقاً غرباً پانچ سو پندرہ فٹ اور شمالاً جنوباً چار سو اڑتیس فٹ ہے۔ سامنے کی دیوار کے بیچ میں ایک بلند اور وسیع محرابی در ہے اور ادھر اُدھر چھوٹے محرابی دروں کی قطاریں ہیں۔ مسجد کا طرز تعمیر فتحپوری سیکری کی دوسری عمارتوں کے طرز سے مختلف ہے۔ محلات وغیرہ میں گنبد و محراب کو زیادہ دخل نہیں دوسرے یہ کہ زینت کے لئے سنگتراشی کے کام کی بجائے سنگ مرمر کے ٹکڑوں سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اس مسجد کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا دروازہ ہے جو دنیا کے بلند ترین اور عظیم ترین دروازوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ شاندار اور وسیع عمارتوں کا ایسا دروازہ بنانا جو متناسب اور موزوں ہو آسان کام نہیں فن تعمیرات کا مشہور ماہر فرگسن اس مسئلہ کی طرف توجہ دلا کر لکھتا ہے

"آدمی خود چھ فٹ اونچے ہوتے ہیں اور وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ ایسے دروازے بنوائیں جن میں ہاتھی گذریں۔ یونانیوں کی یہ ہمت نہ ہوتی کہ اپنے بیرونی دروازوں کو نیچا کریں، چاہے ان کو دروازوں کے اوپر کا حصہ بند ہی کرنا پڑتا چنانچہ وہ صرف نیچے کا حصہ کھلا رکھتے تھے اور اوپر کے حصہ کو مسقف کر دیتے جس سے اکثر ان کے دروازے اس قدر شاندار معلوم ہوتے کہ خود عمارت بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ گوتھک ماہرین فن اپنے قوس نما دروازوں کو باہر کی طرف پھیلا کر اور ان میں سنگتراشی کے کام سے زینت دے کر ایک شان پیدا کرتے تھے جو عمارتوں اور دروازوں میں تناسب قائم رکھنے

کے لئے ضروری تھی، اس کی وجہ سے ان کو یہ ضرورت نہ پڑتی کہ در کا کھلا ہوا حصہ غیر معمولی طور پر بڑھایا جائے۔ لیکن اس مشکل پر عربوں نے اس طرح قابو پایا کہ وہ ایک، تین یا پانچ در بناتے اور پشت کی طرف نیم گنبدی شکل سے اس کو بلندی پر لے جاکر مسقف کرتے یہ نیم گنبدی مسقف حصہ کافی بلند بنایا جاسکتا تھا اور اس میں اور محرابی در میں تناسب قائم رکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔[1]"

اسلامی فن تعمیر کی یہ خصوصیت مغلوں کی عمارتوں میں بہت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی کوئی عمارت ہو، مسجد، مقبرہ، محل، حتی کہ باغ میں بھی دروازہ نہایت وسیع اور شاندار ہوتا ہے، بلکہ بطور خود ایک چھوٹی سی عمارت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مغلیہ دروازوں میں فتحپور سیکری کا بلند دروازہ خاص مقام رکھتا ہے۔ بعض حیثیتوں سے اس کو سب پر تقدم حاصل ہے، اس کو کہیں سے دیکھئے اور کسی طرف سے دیکھئے وہ یکساں شاندار نظر آتا ہے۔ دروازے کی وسعت اور اونچائی کا اندازہ لگانے کے لئے یہ بتایا جاسکتا ہے کہ مع سیڑھیوں کے اُس کی اونچائی ایک سو چھہتر "۱۷۶" فٹ ہے۔ چوڑائی ایک سو تیس "۱۳۰" فٹ اور گہرائی ایک سو تیس فٹ مسجد کے صحن کی دوسری طرف شیخ سلیم چشتیؒ کا مزار ہے۔ یہ خالص سنگ مرمر کا ہے اور بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ابتداء میں یہ بھی سنگِ خارا سے بنا تھا لیکن بعد میں اس کو سنگ مرمر سے مکمل کیا گیا۔ مزار کی عمارت کے چاروں طرف برآمدہ ہے جس میں ایک غلام گردش بھی ہے۔ دیواروں کی جالیاں نہایت خوبصورت اور عمدہ ہیں۔ مزار کے اندر فرش میں قیمتی پتھر لگے ہیں اور دیواروں پر نقش ونگار کا کام ہے۔ قبر پر ایک لکڑی کا کٹہرا ہے جس میں آبنوس اور سیپ کا

---

[1] جیمس فرگسن۔ "ہسٹری آف انڈین اینڈ ایسٹرن آرکٹیکچر"
(لندن۔ ۱۸۹۹ء) ص ۵۸۱

بہت عمدہ کام کیا گیا ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کے عہد میں مغلیہ طرز عمارت کی بنیادی روایات قائم ہوگئیں، چنانچہ ان کا اثر ہم کو صرف شاہی اور سرکاری ہی عمارتوں میں ہی نہیں بلکہ دوسری نجی عمارتوں میں بھی نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ ہندو مندر نے بھی جو اپنے مقاصد اور ضروریات کے لحاظ سے مسجد و مقبرہ سے بالکل مختلف ہے، اس اثر کو بہت بڑی حد تک قبول کیا۔ مثال کے طور پر برندابن مندر جو متھرا کے نزدیک ہی ہے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر گوبند دیو کا مندر جو ۱۵۹۰ء میں تیار ہوا۔ ہندو محلات میں تو مغلیہ طرز کا اثر نہایت نمایاں ہے۔

عہد جہانگیری کی عمارتیں ۱۶۰۶-۱۶۲۷ء

جہانگیر کا شوق اولین مصوری تھا، لیکن اب مغل فن عمارت نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ بادشاہ کی دلچسپی زیادہ نہ ہونے کے باوجود اس عہد کی عمارتیں قابل ذکر ہیں بہ الفاظ دیگر فن تعمیر اس دور میں بھی ترقی کرتا رہا۔ دوسرے یہ کہ جہانگیر ہمت افزائی ضرور کرتا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے باپ اور بیٹے کی طرح ذاتی طور پر اس فن سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتا تھا، اس کے زمانہ کی مشہور عمارت سکندرہ میں اکبر کا مقبرہ ہے۔ یہ ایک بہت وسیع باغ میں واقع ہے جو خود اکبر نے تیار کرایا تھا۔ باغ کے اندر چار مربع قطعے ہیں جن کے درمیان بلند، پختہ راستے ہیں۔ چہار دیواری میں چار دروازے ہیں جن میں تین نمائشی ہیں جو میل قائم رکھنے کے لئے بنائے گئے ہیں اور ایک اصل دروازہ داخلہ کے لئے ہے۔ یہ دروازے بطور خود عمارتیں ہیں جن میں نہایت عمدہ نقش و نگار اور مرصع کاری ہے۔ اس دروازے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ چاروں کونوں پر مینار ہیں جو اس کے بعد مغل عمارتوں میں مخصوص حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اصل

عمارت بہت وسیع ہے اور اس کی پانچ منزلیں ہیں۔ نیچے کی منزل کافی بڑی ہے، اوپر کی منزلیں وسعت میں کم ہوتی گئی ہیں۔ یہ سُرخ پتھر کی ہیں، لیکن آخری منزل سنگ مرمر کی ہے، اس کے صحن کے وسط میں قبر کا تعویذ ہے اور چاروں طرف دالان یا مسقف راستے ہیں جنکی دیواروں میں جالیاں ہیں۔ فنی نقطۂ نظر سے ماہرین نے اس عمارت کو بہت زیادہ قابلِ تحسین خیال نہیں کیا گیا ہے فرگسن نے اپنے ایک نوٹ میں فنچ کے جرنل سے مندرجہ ذیل الفاظ نقل کئے ہیں۔ فنچ نے سکندرہ کو ۱۶۰۹ء میں آخری مرتبہ دیکھا اور اسی وقت کے متعلق لکھتا ہے:

> "جب میں نے اس کو آخری مرتبہ دیکھا تو مقبرہ پر ایک شامیانہ لگا تھا۔ لیکن اس پر ایک محراب دار عمارت نہایت عجیب وغریب قسم کے سنگ مرمر کی بننے والی ہے اور اندر کے سارے حصہ میں سونے کا کام کیا جانے والا ہے۔"

بہرحال اکبر کا مقبرہ طرز کے لحاظ سے دوسرے مقبروں سے بالکل مختلف ہے۔ مقبرہ کی تاریخ سے ایک عبرت انگیز واقعہ منسلک ہے۔ اکبر نے ہندو نوازی کو اپنی پالیسی کی بنیاد بنا کر اس کو اس حد تک بڑھایا تھا کہ مسلمانوں کو اس سے نقصان پہنچا اور بڑی حد تک ان کا مستقبل اس سے متاثر ہوا۔ لیکن ہندوؤں ہی کے ایک فرقہ یعنی جاٹوں نے ۱۶۸۷ء میں شہنشاہ عالمگیر کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر سکندرہ کو لوٹا اور اکبر کی قبر کھود کر اسکی ہڈیوں کو جلا دیا۔ شاید مردہ جسم اور ہڈیوں کے جلانے پر تو اکبر کی روح کو زیادہ پریشانی نہ ہوئی ہوگی کیونکہ اکثر ہندوؤں کی رسوم کو وہ شعائرِ اسلام پر ترجیح دیتا تھا۔ لیکن اس حرکت سے اس کے نام اور شہرت کو صدمہ پہنچا وہ تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔

اعتماد الدولہ

اس دور کی ایک اور قابل ذکر عمارت، اعتماد الدولہ کا مقبرہ ہے۔ جو اس کی بیٹی نور جہاں کا بنوایا ہوا ہے اور انتہائی نازک

اور خوبصورت عمارت ہے۔ وہ خالص اور عمدہ سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے، اور اس میں قیمتی پتھروں سے پچی کاری کا کام کیا گیا ہے۔ مقبرہ کی مربع عمارت کی پہلی منزل کے چاروں کونوں پر چھوٹے چھوٹے مگر خوبصورت مینار ہیں۔ دوسری منزل نہایت مختصر ہے، لیکن پہلی منزل کی چھت کے وسط میں وہ نہایت عمدہ طریقہ پر بنائی گئی ہے۔ نزاکت اور دیدہ زیبی کے علاوہ یہ عمارت دو اور خصوصیات کی بنا پر قابل ذکر ہے۔ مغلوں کی یہ پہلی عمارت ہے جو خالص سنگ مرمر کی ہے اور جس میں پتھر کا وہ کام کیا گیا ہے جس کو اصطلاح میں پیراڈورا کہتے ہیں اور جو شاہجہاں کو اس قدر مرغوب تھا۔

لاہور۔ مقبرہ جہانگیر

نورجہان کی بنوائی ہوئی دوسری عمارت جہانگیر کا مقبرہ شاہدرہ لاہور میں ہے۔ یہ مقبرہ دریائے راوی کے کنارے پر ایک وسیع باغ کے بیچ میں بنایا گیا ہے جو پندرہ سو فٹ مربع ہے، اور برصغیر کے عظیم ترین باغوں میں ہے۔ اس کے اندر پختہ راستے ہیں جن سے سولہ مربع قطعات گئے ہیں، جہاں راستے ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں وہیں فوارے ہیں۔ خود اصل عمارت تین سو پچیس فٹ مربع ہے اور ایک منزلہ ہے لیکن اس کے چاروں گوشوں پر سو سو فٹ اونچے خوبصورت مینار ہیں۔ چھت پر ایک نہایت خوبصورت سنگ مرمر کی شہ نشین کے طرز کی عمارت تھی جو سکھوں کی حکومت کے زمانہ میں تباہ کردی گئی۔ عمارت میں ایک لمبا راستہ ہے جس سے مختلف جانب کے کمروں میں جاسکتے ہیں۔ بیچ میں قبر کا تعویذ ہے ماہرین فن کا خیال ہے کہ اگرچہ ساخت کے لحاظ سے اس عمارت کی کوئی خصوصیت ایسی نہیں جس کو نیا کہا جاسکے لیکن اس میں نقش ونگار اور پچی کاری کا کام اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ اس نے جہانگیر کے مقبرے کو اعلیٰ عمارتوں میں جگہ پانے کا مستحق کردیا ہے۔ باغ کی وسعت اور کشادگی۔ دریا کا قرب اور نقش ونگار اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

شاہجہان کی تعمیرات: ۱۶۲۷-۱۶۵۷ء

شاہجہان کے عہد میں فن تعمیر اپنے انتہائی بلندی کمال پر پہنچ گیا۔ اس کی عمارتیں صرف برصغیر ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی عمارتوں میں امتیازی حیثیت کی مستحق ہیں وہ مغلیہ حکومت کی دولت و ثروت کی زندہ شہادت ہیں، اُن کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں تہذیب و تمدن نے کس قدر ترقی کی اور اسلامی ثقافتی روایات کی سرپرستی میں ہند پاکستانی صنعتوں نے کس حد تک نشو ونما پائی۔ دوسرے متمدن ممالک کے جو سیاح آتے ہیں وہ ان عمارتوں کو دیکھ کر متحیر ہو جاتے ہیں۔ شاہجہانی تعمیرات کی نمایاں خصوصیات میں ان کی نزاکت، تناسب اور سنگ مرمر کا بکثرت استعمال ہیں۔ جہاں تک طرز تعمیر کا تعلق ہے گنبد اور محراب اپنے انتہائی کمال کو پہنچ جاتے ہیں شاہجہاں کا بلند ذوق اس کا مقتضی تھا کہ ان عمارتوں کو بھی بلند معیار پر لایا جائے جو پہلے سے موجود تھیں اور شاہی استعمال میں تھیں۔ چنانچہ آگرہ کے قلعے میں اسی سال جس میں وہ تخت نشین ہوا، اس نے دیوان عام تیار کرایا جس میں سنگ مرمر کا استعمال نمایاں ہے۔ تقریباً دس سال بعد یہیں دیوان خاص تیار کرایا، جس کے دروں کے دوہرے ستون نہایت عمدہ اور شاندار ہیں۔ تیسری قابل ذکر عمارت، موتی محل ہے جو ۱۶۵۴ء میں مکمل ہوئی۔ یہ مسجد حقیقتاً اسم بامسمیٰ ہے۔ وہ اگرچہ ایک چھوٹی سی عمارت ہے لیکن خوبصورتی اور نزاکت کے نقطۂ نظر سے واقعی موتی مسجد کہلانے کی مستحق ہے۔ اس کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنگِ مرمر کو کس حد تک خوبصورت بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے سامنے کے دروں کا تناسب اور خوبصورتی۔ اس کا گنبد اور مسقف دالان سب

نے مل کر اس میں ایک خاص شان اور خوبی پیدا کر دی ہے۔ ان کے علاوہ شاہجہان نے اور عمارتیں بھی سنگ مرمر کی اس قلعہ میں بنوائیں، مثلاً خاص محل، شیش محل، اور مثمن برج وغیرہ۔ اسی طرح اس نے لاہور کے قلعے میں دیوان عام، خواب گاہ، شیش محل، مثمن برج اور نولکھا کی عمارتیں بنوائیں، ان سب میں وہ خوبیاں اور خصوصیات موجود ہیں جو آگرہ کی عمارتوں میں ہیں۔ بلکہ بعض چیزوں میں یہ بہتر بھی ہیں۔ مثلاً نولکھا کا پتھر کا کام زیادہ باریک اور عمدہ ہے۔

شاہجہان آباد

آگرہ اور لاہور کی عمارتوں کے علاوہ دہلی کی بھی بعض عمارتیں لاثانی ہیں، ۱۶۳۸ء میں شاہجہان نے اپنا پایہ تخت آگرہ سے دہلی منتقل کرنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلہ میں وہاں ایک ایسے وسیع اور خوشنما قلعہ و محل کی بنیاد ڈالی گئی جو خود ایک شہر کی مانند تھا۔ شاہ جہاں کا یہ محل جو عرف عام میں لال قلعہ یا قلعہ معلیٰ کہلاتا ہے ایک کتابی شکل کا مستطیل ہے جس کی لمبائی تین ہزار ایک سو فٹ اور چوڑائی ایک ہزار چھ سو پچاس فٹ ہے۔ وہ دریائے جمنا کے سیدھے کنارے پر واقع ہے اس کی بلند چہار دیواری کے مغربی جانب صدر دروازہ ہے۔ یہ لاہوری دروازہ کہلاتا ہے اس کے علاوہ ایک اور دروازہ جنوبی دیوار میں ہے، لاہوری دروازہ سے ایک چوڑا اور مسقف راستہ اندر کی طرف جاتا ہے اس میں دونوں طرف دوکانیں ہیں۔ اس کو چھتہ بازار کہا جاتا ہے۔ یہ مسقف راستہ جو تقریباً پونے چار سو فٹ لمبا ہے، فرگسن کے الفاظ میں، دنیا کے تمام شاہی محلات داخل ہونے کے راستوں سے بہتر ہے[۱] اس کے بعد ایک مستطیل صحن آتا ہے جو ساڑھے پانچ سو فٹ لمبا اور تین سو پچاسی فٹ چوڑا ہے، اس کے وسط میں جنوب کی جانب دیوان عام ہے، جو کم و بیش دو سو فٹ لمبا اور سو فٹ چوڑا

---

[۱] ۔ بشپ ہیبرے نے بھی اسی قسم کے الفاظ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

ہے۔ اس کے بیچ میں ایک وسیع طاق ہے جہاں بادشاہ کا تخت طاؤس، ایک سنگ مرمر کے چبوترے پر رکھا جاتا تھا۔ یہ چبوترہ خود نہایت خوبصورت اور مرصّع تھا۔ تخت طاؤس تو ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اپنے ساتھ لوٹ کے اور مال کے ساتھ لے گیا، لیکن سنگ مرمر کا چبوترہ ایک عرصہ تک اصلی حالت میں رہا۔ اس کا حشر، فرگسن کے الفاظ میں سنئے:

> "جب ہم نے محل پر قبضہ کیا تو ہر شخص نے اپنے من ملنے طریقے پر اس کو لوٹا، منجملہ اور لوٹنے والوں کے کیپٹن سر جان جونسن بھی تھا اس نے اس چبوترے کا ایک حصہ توڑ لیا۔ اس کو یہ اچھا خیال آیا کہ ان پتھر کے ٹکڑوں سے میز کے تختے بنوالئے ان میں سے دو وہ اپنے وطن لے آیا اور وہاں حکومت کے ہاتھ پانچ سو پونڈ میں فروخت کر دئے[۵۰]۔"

اس کے بعد پھر ایک وسیع صحن ہے جس کے شرقی جانب رنگ محل ہے۔ یہ ایک سو ترپن فٹ لمبا اور اُنہتر[۶۹] فٹ چوڑا ہے۔ بیچ میں ایک ہال ہے اور کناروں پر چھوٹے کمرے ہیں۔ اس کی بیرونی دروازوں کی محرابوں میں جالیاں تھیں جو بعد میں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ سب سے زیادہ خوبصورت اور شاندار حصہ دیوان خاص ہے۔ دیوان خاص ساڑھے چار فٹ اونچے چبوترے پر ہے جس کا طول عرض دو سو[۲۴۰] چالیس اور اٹھتر فٹ ہے خود دالان کا طول و عرض نوے[۹۰] اور سڑسٹھ[۶۷] فٹ ہے۔ اس میں بتیس ستونوں کی دوہری قطار ہے۔ چھت مسطح ہے اور چاروں کونوں پر چار چار ستونوں والی برجیاں ہیں۔ ان پر چھتریاں اور سنہری کلس ہیں۔ دیوان خاص کے اندر نہایت عمدہ پچی کاری کا کام ہے۔ اس میں مختلف رنگوں کے پتھر نہایت خوبی کے ساتھ لگائے گئے ہیں اور بیل بوٹے

۵۰۔ فرگسن ص ۵۹۳ (نوٹ نمبر ۱)

اور پھول پتے بنا کر اس کو زینت دی گئی ہے۔ مشہور سیاحوں اور مصنفوں میں سے جس نے بھی اس کو دیکھا ہے اس کی بے حد تعریف کی ہے۔ ہال کی کارنس کے نیچے کونے کی محرابوں پر یہ شعر لکھا ہوا ہے:۔

اگر فردوس بر روئے زمین است   ہمیں است وہمیں است وہمیں است

قلعہ معلیٰ کی بہت سی عمارتیں اب معدوم ہو چکی ہیں۔ جو اب باقی ہیں ان میں تعمیرات کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے حمام، تسبیح خانہ، خواب گاہ اور مثمن برج قابل دید ہیں۔ دہلی کے قلعہ میں بھی موتی مسجد ہے، اس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ ان عمارتوں کے بیچ میں ایک نہر بہتی تھی جس سے ان کی خوبی دوبالا ہو گئی تھی۔ من حیث المجموع شاہجہاں کا یہ محل اپنی عمارتی خوبیوں اور نفاست تزئین کے لحاظ سے بلا شک وشبہ دنیا کے بہترین محلوں میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے۔

مساجد دہلی، آگرہ، ٹھٹہ

شاہجہاں کی خواہش تھی کہ اس کا نیا دارالحکومت جو شاہجہان آباد کہلاتا تھا دنیا کے اعلیٰ ترین شہروں میں سے ایک ہو۔ اپنے محل کے قریب ہی اس نے جامع مسجد تیار کرائی۔ اس مسجد کو دیکھتے ہی پہلا اثر اس کی بلند کرسی کا ہوتا ہے۔ وہ چبوترہ جس پر مسجد کی عمارت بنائی گئی ہے تیس ۳۰ فٹ اونچا ہے اور چودہ سو مربع گز اس کا رقبہ ہے۔ قبلہ کی جانب (مغربی سمت) کو چھوڑ کر باقی تین طرف خوشنما اور وسیع دروازے ہیں جن کی شان اس سبب سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ وہ بلندی پر واقع ہیں اور ان تک پہنچنے کے لئے نہایت وسیع اور شاندار سیڑھیاں ہیں۔ شاہی زمانہ میں شرقی دروازہ جو لال قلعہ کے سامنے تھا بادشاہوں کے استعمال کے لئے کھولا جاتا تھا اور شمال وجنوب کی طرف کے دروازے اور لوگوں کے لئے۔ مسجد کا صحن تین سو پچیس ۳۲۵ فٹ مربع ہے۔ اس کے وسط میں ایک بڑا حوض ہے اور تین طرف مسقف دالان ہیں۔ اصل عمارت عرض میں دو سو فٹ اور گہرائی میں نوّے ۹۰ فٹ

ہے، سامنے کی دیوار میں گیارہ محرابی در ہیں جن پر سفید اور سیاہ پتھر کا کام ہے۔ قبلہ کیجانب کی دیوار میں نہایت خوشنما محرابیں بنائی گئی ہیں۔ مسجد کی چھت پر تین بڑے گنبد ہیں جن پر سنگ موسیٰ اور سنگ سُرخ کی پٹیاں ہیں۔ عمارت کے دونوں کناروں پر سنگ سُرخ کے ایک سو تیس ۱۳۰ فٹ بلند مینار ہیں۔ ان کے اندر چکردار زینے ہیں جن سے اوپر تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اوپر کی برجی بارہ دری ہے۔ پشت کی طرف چار چھوٹے برجی دار مینار ہیں۔ فن تعمیر، تناسب اور خوبصورتی و دیدہ زیبی، ہر نقطۂ نظر سے یہ عمارت لاجواب کہی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب انگریزوں کا دہلی پر دوبارہ قبضہ ہوا تو جذبہ انتقام کی آگ نے ان کو آپے سے باہر کر دیا تھا۔ ان کے بعض حکام چاہتے تھے کہ مسجد کو بارود سے اڑا دیا جائے تاکہ اس کا نام و نشان باقی نہ رہے۔ بعض کی خواہش تھی کہ اس کو گرجا میں منتقل کر دیا جائے۔ بہرحال آخر میں یہ طے ہوا کہ اس کو مسلمانوں سے لے کر اپنے قبضہ میں رکھا جائے۔ لیکن آخر کار ۱۸۶۲ء میں اس کو واگذاشت کر دیا گیا اور اس وقت سے مسلمان اس میں نماز پڑھتے ہیں۔ آگرہ کی جامع مسجد بھی بہت خوبصورت اور شاندار ہے لیکن دہلی کی مسجد کے مقابلہ میں وہ چھوٹی ہے، اس کا طول وعرض ایک سو تیس ۱۳۰ اور سو فٹ ہے، اس میں اونچے مینار بھی نہیں ہیں، لیکن اس کے مختلف حصوں کا تناسب، سامنے کی دیوار میں محرابی دروں کے درمیان فاصلہ، اور ان کے اوپر چھوٹی چھوٹی برجیوں نے اس میں ایک خصوصی شان پیدا کر دی ہے۔

آگرہ کی مسجد کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ فن تعمیر کے مورخوں کے لئے یہ ایک مسئلہ تھا کہ مسلمان کاریگر بڑی بڑی محرابوں کے لئے سینٹرنگ کس طرح تیار کرتے تھے۔ اس مسجد کی جب تعمیر ختم ہوگئی تو ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ سینٹرنگ کی لکڑی جو شخص چاہے لیجا سکتا ہے اور روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ شام ہونے سے پہلے ہی ساری لکڑی لوگ لے گئے اور اس پر حکومت کا کچھ خرچ نہیں ہوا۔ اس سے یہ اندازہ ہوگیا کہ محرابوں اور گنبدوں کے

لئے جو ڈھانچے تیار کئے جاتے تھے وہ لکڑی کے ہوتے تھے۔ شاہجہان کی خوبصورت، سنگ مرمر کی مسجدوں میں دو اور قابل ذکر ہیں، اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ میں اور ایک کابل میں۔ یہ دونوں خالص سنگ مرمر کی ہیں اور ان میں بھی وہی نفاست ہے جو اس بادشاہ کی اور عمارتوں میں ہے۔ ٹھٹہ کی جامع مسجد اپنی نوعیت کی تنہا ہے، وہ اینٹ کی عمارت ہے، آب و ہوا کی مخصوص کیفیات کے پیش نظر اس کا نقشہ دہلی وغیرہ کی مسجدوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ فنی لحاظ سے یہ بہت اہم عمارت ہے،۔

تاج محل

فن تعمیر و تزئین عمارات کا انتہائی نقطہ کمال ہم کو شاہجہان کی محبوب بیوی ممتاز محل کے مقبرہ میں نظر آتا ہے[1]۔ اس کا شمار آج بھی دنیا کی لاثانی عمارتوں میں ہوتا ہے۔ آگرہ میں دریائے جمنا کے کنارے یہ خوبصورت عمارت ایک وسیع مستطیل قطعہ زمین پر واقع ہے جس کا طول انیس سو (۱۹۰۰) اور عرض ایک ہزار (۱۰۰۰) فٹ ہے۔ اصل عمارت ایک باغ کے وسط میں بنائی گئی ہے جو ایک ہزار فٹ مربع ہے۔ یہ باغ اور بقیہ زمین سب ایک چہار دیواری سے محصور ہیں، جس کے جنوبی رخ پر نہایت وسیع اور شاندار صدر دروازہ ہے۔ اصل عمارت ایک وسیع چبوترے پر بیچ میں ہے۔

---

[1] بعض مغربی مورخوں نے لکھا ہے کہ تاج کی "پلان" تیار کرنے والا ایک وینس کا جوہری تھا جس کا نام وہ لوگ جیرونیمو ویرونیو بتلاتے ہیں۔ اس غلط فہمی کے پیدا کرنے کا سہرا ایک ہسپانوی پادری فادر منریک کے سر ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے تاج کے متعلق معاصر اور دستاویزی شہادتیں موجود ہیں اور اس غلط نظریہ کو کوئی وقعت نہیں دی جا سکتی۔ جو لوگ مغلوں اور مسلمانوں کے فن تعمیر سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ تاج محل کو دیکھ کر ایک لمحے میں یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس پر کسی حیثیت سے بھی غیر اسلامی یا بیرونی اثر نہیں۔

اس کے دو طرف یعنی شرق و غرب کی جانب دو عمارتیں اور ہیں۔ مغرب کی جانب تو مسجد ہے لیکن دوسری طرف اس کے مقابلہ میں اسی نمونہ کی عمارت بنوا دی گئی ہے تاکہ خالی طرف کا حصہ بھدّا نظر نہ آئے۔ یہ آخر الذکر عمارت جو حقیقتاً مسجد کا 'جواب' ہے مہمان خانہ کہلاتا ہے اور غالباً لوگوں کے استقبال کے لئے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ اصل مقبرہ کی عمارت ایک بائیس ۲۲ فٹ بلند کرسی پر ہے اور اس کا طول و عرض دونوں ایک سو چھیاسی فٹ ہیں۔ ہر کونے پر ایک برجی ہے اور وسط میں نہایت خوبصورت، قمقمہ نما دوہرا گنبد جس کی اونچائی ایک سو اٹھاسی ۱۸۸ فٹ ہے۔ عمارت کی خوبصورتی میں اضافہ کی غرض سے کرسی کے چاروں کونوں پر تین تین منزلہ مینار ہیں، جن کی بلندی ایک سو سینتیس ۱۳۷ فٹ ہے۔

عمارت کی پلان نہایت سادہ ہے لیکن اس کی ایک بڑی خوبی اس کا تناسب ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا بڑا با کمال شخص تھا۔ عمارت کا طول عرض اور بلندی برابر ہیں۔ سامنے کی دیوار کی بلندی اوسی قدر ہے جتنی کہ گنبد کی۔ یہ چند خصوصیات ہیں۔ جنہوں نے مل کر تاج محل کو ایک لاثانی عمارت بنا دیا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں خوبی اس کا گنبد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک "گلوب" ہے جس کے نیچے کا حصہ ڈرم سے کٹ گیا ہے۔ باہر سے ہی نہیں بلکہ اندر جا کر دیکھنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ تاج محل کے بنانے والوں کے سامنے ہمایوں کا مقبرہ نمونہ کے طور پر تھا۔ اندر کا صدر ہال' ہمایوں کے مقبرہ کی طرح ہشت پہل ہے اور اس کے ہر جانب چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جن میں ایک سے دوسرے میں جانے کا راستہ ہے۔ تاج محل کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی پچی کاری کا کام ہے جو نفاست میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

خاص طور پر قبر اور تعویذوں پر جو کام ہے وہ تو دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اس کی خوبی اور صناعی کو الفاظ کے ذریعہ پیش کرنا کسی صورت سے بھی ممکن نہیں صرف دیکھ کر ہی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ساری عمارت اعلیٰ قسم کے سنگ مرمر

کی بنی ہوئی ہے۔ تاج کو بنے ہوئے تین صدیوں سے زائد زمانہ گذر چکا ہے، لیکن آج بھی دنیا کے ہر حصہ سے آنے والے سیاح بصد شوق اس عمارت کو دیکھنے جاتے ہیں۔ تاج کے متعلق فرگسن کی رائے اس قابل ہے کہ اس کو یہاں پیش کیا جائے۔ وہ لکھتا ہے!

"وہ بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہے .... من حیث المجموع ایک وہ چیز پیدا کر دی گئی ہے جس کا جواب دنیا میں نہیں مل سکتا۔ اس سے وہ شخص بھی اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جو عمارتوں کی خوبی سے اثر قبول کرنے کا عادی نہ ہو"[1]

جب شاہجہاں سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی عمارتوں کو خوبی اور خوشنمائی کے لحاظ سے انتہائی نقطۂ کمال پر پہنچا رہا تھا اسی زمانہ میں شمال مغربی علاقے میں ایک نیا طرز ترقی کر رہا تھا۔ اس کی دو خصوصیات تھیں ایک تو یہ کہ عمارت کی تعمیر تو اینٹوں سے ہوتی تھی لیکن کہیں مضبوطی کی غرض سے پتھر بھی استعمال کر لیا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ تزئین کے لئے مختلف اللون ٹائل دیواروں پر کثرت سے لگائے جاتے تھے۔ پہلی خصوصیت کا اصلی سبب یہ تھا کہ اس علاقہ میں عمدہ قسم کا پتھر کمیاب ہے اور دوسری خصوصیت ایرانی طرز تزئین کے اثر کا نتیجہ تھا۔ اس طرز کی سب سے بہتر عمارت لاہور میں وزیر خاں کی مسجد ہے۔ دوسری قابل ذکر عمارتیں گلابی باغ، چوبرجی اور مقبرہ علی مردان خان، شالامار باغ اور مقبرہ دائی انگہ ہیں۔ مسجد وزیر خان کی پلان تو مسجد کی روایتی پلان سے مختلف نہیں لیکن اس کے چار ہشت پہل مینار اور وسیع صدر دروازہ خاص طور پہ نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں خصوصیات ٹائلوں کا بکثرت استعمال ہے۔

بہ ظاہر ہے کہ ان عمارتوں کو تاج محل یا جامع مسجد دہلی کے مقابلہ میں پیش نہیں

---

[1] صفحہ ۵۹۵

کیا جاسکتا، لیکن ماہرین فن کے لئے ان کی خصوصیات بہت دلچسپ اور اہم ہیں۔

عالم گیر کا عہد ۱۶۵۷ - ۱۷۰۷ء

ماہرین کی یہ متفقہ رائے ہے کہ فن تعمیر' شاہجہان کے عہد اور اس کی سرپرستی میں اپنے اوج کمال پر پہنچ گیا تھا اور اس کے بعد اس کا انحطاط شروع ہوجاتا ہے۔ اس انحطاط کے مختلف اسباب ہیں۔ ایک ان میں عالمگیر کے کردار و مزاق کی مخصوص کیفیات بھی ہیں۔ یہ درویش صفت بادشاہ کسی ایسے فن سے کب دلچسپی لے سکتا تھا جس سے شان وشوکت کا اظہار ہوتا ہو' دوسرے یہ کہ قیمتی عمارتوں میں جو روپیہ صرف ہوتا تھا وہ اس کے خیال میں بہتر اور دیرپا آثار پر خرچ کیا جاسکتا تھا۔ جو لوگ ثقافت کے دائرے کو محدود کرنا چاہتے ہیں' یہ سمجھتے ہیں کہ جہانگیر وشاہجہاں نے تو ثقافتی ترقی میں حصہ لیا لیکن عالمگیر میں اس کی صلاحیت نہ تھی۔ یہ نتائج نظریات تاریخ کے تنگ نظر مفہومات کی بناء پر مرتب کئے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ثقافتی ورثہ کے متعدد پہلو اور شعبے ہیں جس طرح قطب مینار' بلند دروازہ تخت طاؤس' شالامار باغ اور مصوری کے مغل اسکول کا شمار اسلامی ثقافت کے مایۂ ناز ورثہ میں ہوتا ہے اسی طرح فتاویٰ عالمگیری کی تدوین بھی ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر ہم فخر کرسکتے ہیں۔ اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا بھی غلط ہوگا کہ عالمگیر کے عہد کی کوئی عمارت قابل ذکر نہیں۔ اس کے عہد کی چند مخصوص عمارتیں فنی خصوصیات کے لحاظ سے بھی یقیناً قابل ذکر ہیں۔

بادشاہی مسجد

عالمگیر کو اپنے طویل دوران حکومت کا نصف سے زائد حصہ دکن میں گذارنا پڑا۔ اس سلسلہ میں اورنگ آباد جو اس کا مستقر تھا' عملی طور پر ایک دوسرا دارالحکومت بن گیا تھا۔ یہیں اس کا مزار بھی ہے۔

لیکن اس کا ماحول اور اس کی عمارات شاہانہ نہیں، درویشانہ ہیں۔ اورنگ آباد کی قابل ذکر عمارت عالمگیر کی ایک بیوی رابعہ دورانی کا مقبرہ ہے۔ اس کو تاج محل کے نمونہ پر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ شکل و طرز وہی ہے لیکن خوبی اور کمالِ فن میں بہت فرق ہے[۱]۔ عالمگیری عہد کی تعمیرات کا شاہکار، لاہور کی بادشاہی مسجد ہے جو ۱۶۷۴ء میں بن کر تیار ہوئی۔ طرز میں اس کی عمارت دہلی کی جامع مسجد سے مشابہ ہے اور اسی کی طرح شاندار ہے۔ اصل عمارت اگرچہ دہلی کی مسجد سے قدرے چھوٹی ہے لیکن اسی طرح اس میں گیارہ محرابی در ہیں، جن میں زیچ کا بہت وسیع اور بلند ہے اور اِدھر اُدھر کے چھوٹے۔ اس کے چاروں کونوں پر بھی ہشت پہل مینار ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ دہلی کی مسجد میں سامنے کے مینار کافی بلند ہیں۔ اس کے علاوہ لاہور کی مسجد پر بھی تین گنبد ہیں۔ دونوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ لاہور کی مسجد میں صحن کے کونوں پر بلند مینار ہیں جو دہلی میں نہیں۔ سامنے کی دیوار، دہلی کی مسجد میں زیادہ خوبصورت ہے اور اس پر کام بہتر ہے۔ گنبد دونوں مسجدوں میں اسی طرز کے ہیں جیسا کہ تاج کا گنبد، یعنی قمقمہ نما۔ ان تینوں عمارتوں کے گنبدوں میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ ڈرم سے متصل ہونے سے پہلے گنبد کے نیچے کا حصہ تنگ کر دیا گیا ہے، اس سے گنبد کی شکل میں خوشنمائی پیدا ہو گئی ہے۔

موتی مسجد

عالمگیر کے ذوق کا صحیح نمونہ ہم کو تو قلعۂ دہلی کی موتی مسجد میں ملتا ہے۔ تخت نشینی کے بعد جلد ہی عالمگیر کو احساس ہوا کہ نماز باجماعت ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قریب ہی مسجد ہو چنانچہ ایک چھوٹی لیکن نہایت خوبصورت مسجد سنگِ مرمر کی بنائی گئی۔ اس خوبصورت عبادت گاہ کو موتی مسجد

---

[۱] نرگسن - ۶۰۲

کا نام دیا گیا اور بقول پرسی براؤن یہ نام اس کے لئے غلط نہیں۔ یہ نہایت اعلیٰ قسم کے سنگ مرمر سے تیار کی گئی ہے جس کی خوبی سنگتراشی کے کام کی بدولت نمایاں ہو گئی ہے۔ اس میں داخل ہوتے ہی پہلا اثر دیکھنے والے پر یہ ہی ہوتا ہے کہ حقیقتاً عمارتوں میں یہ موتی ہی ہے۔ ان دو مسجدوں کے علاوہ عالمگیر نے اور بھی مسجدیں بنوائیں۔ شمالی ہند پاکستان میں بنارس اور متھرا کی مسجدیں قابل ذکر ہیں اگرچہ ان کی اہمیت تاریخی ہے نہ کہ فنی، پھر بھی ان میں چند خصوصیات قابل غور ہیں۔ بنارس کی مسجد کی نمایاں خصوصیت اس کے میناروں کی بلندی ہے کیوں کہ یہ دو سَو فٹ اونچے ہیں۔ اور اسی خصوصیت نے اس کو اس علاقہ میں سب سے نمایاں عمارت کی حیثیت دے دی ہے۔ متھرا کی مسجد میں اینٹ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی کرسی بہت بلند ہے۔ ہر کونے پر بارہ پہل مینار ہیں جن میں پانچ درجے ہیں۔ یہ بھی بنارس کی مسجد کی طرح اس علاقے میں نہایت نمایاں عمارت معلوم ہوتی ہے۔

فن تعمیر اور مسلم عمارات کا جو مختصر حال یہاں بیان کیا گیا ہے اس سے مسلمان کے کارناموں کی صحیح اور مکمل تصویر تو ذہن میں نہیں آسکتی کیونکہ اس کے لئے تو تفصیلات کا مطالعہ ضروری ہے۔ لیکن اس مختصر خاکہ سے بھی یہ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے برصغیر میں بعض دوسرے علاقوں کی طرح اس فن کو اس نقطہ کمال تک پہنچا دیا جہاں سے آگے بڑھنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا۔ مغلوں کے انحطاط کے بعد یہاں مختلف اقوام کو علاقائی اقتدار حاصل ہوا اور بالآخر ایک بیرونی طاقت برصغیر پر مسلط ہو گئی۔ لیکن عالمگیر کے بعد ڈھائی سَو (۲۵۰) سال کی مدت میں ایک عمارت بھی ایسی تیار نہ ہو سکی جو تاج محل یا جامع مسجد کے مقابلہ میں پیش کی جا سکے۔

مغلوں کے باغات

بے محل نہ ہوگا اگر تعمیرات کے سلسلہ میں مغلوں کے باغات کا بھی مختصر الفاظ میں ذکر کردیا جائے۔ باغات کا فن تعمیر سے براہِ راست تو تعلق نہیں مگر مسلمانوں نے اپنی وسیع عمارتوں میں باغ لگائے اور اس طرح دونوں میں ایک قسم کا رشتہ پیدا ہوگیا۔ مغلوں سے پہلے باغ زیادہ تر پھلوں کے درختوں سے پُر ہوتے تھے۔ برصغیر کے پھلوں میں آم بہت زیادہ مقبول ہے، اس لئے لوگ کثرت سے آم کے پیڑ لگاتے اور اس کو باغ کہتے تھے۔ مسلمان اپنے ساتھ پھولوں کے درخت بھی لائے اور یہ بھی باغوں میں لگائے جانے لگے۔ بعض مسلمان حکمرانوں کو باغوں سے بہت دلچسپی تھی جس طرح وہ عمارتیں تیار کراتے تھے۔ اسی طرح باغات بھی لگواتے تھے۔ سلطان معزالدین کیقباد کے دارالحکومت کے چاروں طرف دور تک باغات کا سلسلہ تھا۔ حضرت امیر خسرو نے اس کیطرف ایک شعر میں اشارہ کیا ہے۔

تا بہ دو فرسنگ بہ پیرامنش   روضہ باغ و چمن گلشنش[1]

---

[1] مثنوی قران السعدین۔ مطبوعہ نولکشور پریس۔ ص ۲۶

سلاطین دہلی میں سب سے زیادہ باغات فیروز شاہ نے لگوائے۔ حصار فیروزہ کی تعمیر کے سلسلہ میں شمس سراج عفیف لکھتا ہے!

"باغات بسیار اشجار بے شمار نہال کنانید"۔

لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ یہ باغ پھولوں کے نہیں، پھلوں کے تھے۔ چنانچہ اسی کے الفاظ ہیں!

"از ہر جنس میوہ داران باغات بار گرفتہ"[1]

اس نے دہلی کے گرد و نواح میں تقریباً بارہ سو باغ لگوائے لیکن یہ بھی اسی مقصد سے لگوائے گئے تھے کہ سلطنت کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ سلطان محمد بن تغلق کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے صاحب مسالک الابصار نے متعدد میوہ جات اور پھلوں کے نام گنائے ہیں جو ہند پاکستان کے مختلف علاقوں میں ملتے تھے۔ ان ہی کو باغ کہتے تھے اور یہ ہی باغات ہیں جن کا ذکر سلاطین دہلی کے عہد کی تاریخوں میں کیا گیا ہے۔

بابر کے باغات

غالباً یہی وجہ تھی کہ بابر کو برصغیر کے باغات پسند نہیں آئے اس کو اپنی توزک میں شکایت کا موقع ملا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ باغ کا جدید تصور یہاں مغلوں ہی کے ساتھ آیا[2]۔ جنگ پانی پت میں اپنی شاندار فتح کی یادگار کے لئے بابر نے کوئی مینار یا عمارت تعمیر نہیں کرائی ایک باغ لگوایا جس کو کابلی باغ کا نام دیا گیا۔ اس روایت کو اس نے بعد میں بھی قائم رکھا اور اپنی دوسری فتوحات کی یادگاریں، بھی باغوں کی شکل میں چھوڑیں۔ آگرہ میں اس نے ایک بڑا باغ لگوایا جس کے اب صرف کچھ آثار باقی ہیں۔ جہانگیر اس باغ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۲۷ و ۱۲۸

[2] مسز اسٹورٹ۔ گارڈنز آف دی گریٹ مغلز (لندن۔ ۱۹۱۳ء) ص ۴

"حضرت فردوس مکانی بابر بادشاہ بعد از شکست دادن ابراہیم ولد سکندر لودی وکشتہ گشتن او و فتح رانا سانگا کہ کلاں ترین راجہا و زمینداران ولایت ہندوستان بود بر طرف شرقی آب جمنا زمینے خوش کردہ چار باغے احداث فرمودند کہ در کم جائی جان لطافت باغ بودہ باشد، نام آں گل افشاں فرمودند و عمارت مختصری از سنگ سرخ تراشیدہ ساختہ اند و مسجدی بر یک جانب آن باغ بہ اتمام رسیدہ در خاطر داشتند کہ عمارت عالی بسازند، چون عمر دفانہ کرد از قوہ بفعل نیامد"۔[۱]

یہ امر قابل غور ہے کہ اس میں بھی پھولوں کے علاوہ بعض پھلوں کے درخت لگوائے گئے تھے۔ جہانگیر نے ہی ذکر کیا ہے کہ گل افشاں میں ہر سال کئی ہزار انناس آتے تھے۔ اب صرف مسجد اور چاروں گوشوں کی برجیوں کے کچھ آثار باقی ہیں۔

ہمایوں کو تو ظاہر ہے کہ باغات کی تیاری کا موقع نہیں مل سکتا تھا، لیکن اکبر کی توجہ بھی زیادہ عمارات اور دفاعی قلعوں کی طرف رہی۔ پھر بھی اس کے باغات کا ذکر ہم کو تاریخی کتابوں میں ملتا ہے۔ کشمیر کو اسی نے مغلیہ سلطنت میں شامل کیا، اور اسی نے اس خطۂ جنت نظیر کو زیادہ دلکش بنانے اور وہاں کی تفریح گاہوں میں اضافہ کرنے کا سلسلہ شروع کیا جو بعد میں اس کے بیٹے اور پوتے کے زمانہ میں بھی جاری رہا۔ کشمیر میں اکبر کا نگین باغ آج آباد نہیں لیکن وہ یہ ضرور ظاہر کرتا ہے کہ اس کو باغات سے دلچسپی تھی۔

عہد جہانگیری کے باغات

جہانگیر کو باغات کا بے حد شوق تھا۔ جہاں بھی وہ جاتا عمدہ باغات کی سیر کرتا۔ تخت نشینی کے چند سال

---

[۱] توزک جہانگیری ص ۲-۳

بعد ہی وہ کابل گیا، وہاں کے سات باغوں کا ذکر اپنی توزک میں کرتا ہے۔ ان میں ایک باغ "مادر کلاں پدر من بگہ بیگم" کا بنوایا ہوا تھا اور ایک اور باغ مریم مکانی (یعنی مادر کلاں حقیقی من) نے بنوایا تھا۔ لیکن شاید اس کو باغ شہر آرا بہت پسند تھا[1]۔ اس کے لگوائے ہوئے بعض باغات اس قدر مقبول ہوئے کہ آج تک وہ تفریح گاہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اکبر کے مقبرہ یعنی سکندرہ کے باغ کے متعلق وہ خود ہی کہتا ہے کہ "باغے در غایت صفا بر دور عمارت مقبرہ منورہ ترتیب یافت"، مولوی سعید احمد ماہروی نے مرقع اکبرآباد میں جہانگیر کے ایک اور باغ کا بھی ذکر کیا ہے جو بلند باغ یا بتیس کھمبہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ایک بلند مینار باقی ہے جو سنگ سرخ کا ہے۔ جہانگیر کو خطۂ کشمیر بے حد پسند تھا۔ توزک میں اس نے کئی صفحے اس کی خصوصیات کے لئے وقف کئے ہیں اور وہاں کے پھولوں اور سیر گاہوں کا ذکر مفصل طریقہ پر کیا ہے۔ اس نے یہاں کئی باغ لگوائے جن میں باغ نور افزا کا ذکر مرزا کامگار، صاحب ماثر جہانگیری نے کیا ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اس باغ کی تعمیر کا کام مرزا کامگار ہی کے سپرد کیا گیا تھا[2]۔ اس کے علاوہ کشمیر ہی میں ویری ناگ پر بھی اس نے ایک باغ لگوایا جس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"نام شہر سری نگر است و دریائے بہت از میان معمورہ می گذرد و سرچشمہ آن را ویری ناگ می گویند، از شہر چہار دہ کروہ بر سمت جنوب واقع است و بحکم این نیاز مند بر سر آن چشمہ عمارتے و باغے ترتیب یافتہ[3]۔"

---

[1] توزک جہانگیری ص ۵۱

[2] ماثر جہانگیری قلمی نسخہ (ص ۳۰۳)

[3] توزک جہانگیری ص ۲۹۸

[4] توزک جہانگیری ص ۵۱

لیکن سب سے زیادہ مشہور اور آباد باغ جو جہانگیر نے شروع کرایا اور بعد میں شاہجہاں نے اس کی تکمیل کی فرحت (فرح) بخش یا شالامار باغ ہے[1]۔ اس کی تکمیل کا ذکر ہم کو عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ میں ملتا ہے:۔

"سابقاً این حدیقہ رشیعہ بہ شالامار معروف بود۔ دریں ولا کہ شرف قدوم نخل پیرائے ریاض خلافت زیب وزینت تازہ یافت، و فیض و میمنت بے اندازہ و ریاحین و اشجار آن در کمال تنومندی و سرسبزی و رنگینی و شادابی بہ نظر کیمیا اثر در آمد، بہ فرح بخش موسوم گردید[2]۔"

شاہجہان کو اگرچہ زیادہ دلچسپی تعمیرات سے تھی، لیکن پھر بھی اس کی بلند ذوقی کا تقاضا یہی تھا کہ نہ صرف قدیم باغات اور سیر گاہوں کو قائم اور اصلی حالت میں رکھے بلکہ یہ کہ نئے باغات تیار کرائے اور قدیم باغوں کو بہتر بنائے۔ خود کشمیر ہی میں شالامار باغ میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا۔ اسی باغ کے قریب ایک اور باغ لگوایا جس کو فیض بخش کے نام سے موسوم کیا۔

"حکم شد کہ خیابان آن بہ پہنائی خیابان فرح بخش بہ سازند و شاہ نہر بہ عرض پانزدہ گز از میان بگذرد و سہ قطار فوارہ دوران جوشان باشد۔"

ان فواروں کی تعداد ایک سو چوالیس[۱۴۴] تھی۔ ایک دوسرا باغ بحر آرا تیار کیا گیا جو آج کل بہار مشہور ہے۔ بادشاہ نامہ میں اور بھی چند باغوں کا ذکر ہے مثلاً شہزادہ مراد کے

---

[1] دیکھو سر رچرڈ ٹمپل کا جرنل حیدر آباد ۔ کشمیر و نیپال (لندن ۔ ۱۸۸۷ء)

جلد دوم ۔ ص ۵۶

[2] بادشاہ نامہ ۔ جلد اول ۔ حصہ دوم ص ۲۴

نام پر باغ مراد بنا۔ شاہ جہاں کے جس باغ نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ لاہور کا شالامار باغ ہے جو کشمیر کے باغ کی وضع پر تیار کیا گیا تھا۔ اس کی بیرونی دیوار کا طول بارہ سو قدم اور عرض آٹھ سو قدم ہے۔ اس میں تین قطعے ہیں جن کی بلندی میں بارہ سے پندرہ فٹ کا فرق ہے۔ پہلے قطعہ پر سنگ مرمر کی ایک بارہ دری ہے اور درمیان کے قطعے پر نہر سے پانی آتا ہے اس میں ساڑھے چار سو فوارے ہیں جو چلتے وقت نہایت دلپذیر منظر پیدا کر دیتے ہیں۔ مشہور ہے کہ عالمگیر کی بیٹی زیب النساء نے ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ اشعار کہے تھے:

اے آبشار نوحہ گر از بہر کیستی؟
چین بر جبیں فگندہ ز اندوہ کیستی؟
آیا چہ درد بود کہ چون ما تمام شب
سر را بہ سنگ می زدی و می گریستی؟[۱]

شالامار[۲] کی تعمیر پر چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ ابتداء میں یہ باغ بھی فرح بخش ہی کہلاتا تھا۔ لیکن بعد میں شالامار کے نام سے مشہور ہوا[۳]۔

---

[۱] دیکھو سید محمد لطیف۔ لاہور۔ (لاہور ۱۹۵۶ء) ص ۱۴۱

[۲] اس کی تاریخ مندرجہ ذیل اشعار میں ہے:۔

چون شاہ جہان بادشاہ حامی دین
آراستہ شالہ مار با طرز متین
تاریخ بنائے این ز رضوان جستم
گفتا کہ بگو نمونہ خلد برین

نمونہ خلد بریں سے ۱۰۴۷ھ نکلتی ہے جو ۱۶۳۷ء کے مطابق تھی۔

لطیف ص ۱۴۴

آگرہ میں بھی عہد شاہجہانی کے کچھ باغات قابل ذکر ہیں۔ مہتاب باغ اس نے ایام شاہزادگی میں تیار کرایا تھا۔ اس کی چہار دیواری کا ہر ضلع نو سو چھہتّر فٹ تھا۔ جمنا میں طغیانی کی وجہ سے اس کو سخت نقصان پہنچ گیا تھا۔ اس کا ذکر ہم کو عالمگیر کے ایک خط میں ان الفاظ میں ملتا ہے:

"باغ مہتاب را تمام آب گرفتہ بود۔ بنا برآن از صفا افتادہ
عنقریب طراوت تازہ خواہد یافت......"[1]

آگرہ میں دو باغ یعنی موتی باغ اور باغ قندھاری بیگم، شاہجہان کی دو بیویوں نے بنوائے تھے، یہ اب غیر آباد ہیں۔ ان کے علاوہ تاج محل کا باغ بھی قابل ذکر ہے جو آج بھی آباد و شاداب ہے۔ بادشاہ کے بنوائے ہوئے باغوں کے ساتھ امراء اور شہزادوں اور شہزادیوں کے باغوں کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً باغ مہابت خان موضع راجپور میں واقع ہے باغ وزیر خان[2]، باغ جہاں آرا بیگم و باغ سلطان پرویز[3]

عالمگیر کے بعد دور انحطاط میں بھی بعض باغات بنوائے گئے۔ مثال کے طور پر

---

[1] بحوالہ مرقع اکبر آباد ص ۱۰۰

[2] وزیر خان جن کا اصلی نام حکیم علم الدین تھا، چنیوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ شاہ جہاں کے معتمد امراء میں تھے۔ ۱۶۴۰ء میں آگرہ میں جہاں وہ صوبہ دار تھے، انتقال کیا۔ لاہور میں ان کی بنوائی ہوئی مسجد بہت عمدہ عمارت ہے، اس کا ذکر پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔

[3] سلطان پرویز جہانگیر کا بیٹا تھا۔ ۱۶۲۶ء میں اس نے وفات پائی اور اسی باغ میں دفن ہوا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے یہ باغ کسی ہندو کو حکومت کی خیرخواہی کے صلہ میں دے دیا تھا۔ وسط میں چبوترہ پر مقبرہ ہے۔ جو اب نہایت شکستہ حالت میں ہے۔"
مرقع اکبر آباد ص ۹۰

قدسیہ باغ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ باغ محمد شاہ (۱۷۱۹ - ۱۷۴۸ء) کی بیوی نے تیار کرایا تھا۔ اور اپنے نام پر ہی اس کا نام رکھا تھا۔ اب یہ باغ موجود نہیں اگرچہ وہ علاقہ آج بھی قدسیہ باغ ہی کہلاتا ہے۔ جنگ آزادی میں دہلی کے محاصرہ کے وقت یہاں انگریزوں اور انقلابیوں میں متعدد جھڑپیں ہوئیں اور اس کو خاصی اہمیت حاصل ہو گئی۔ بعد میں انگریز سردار جنرل نکلسن کا مجسمہ بھی اس کے ایک قطعہ میں رکھا گیا اور اس کو نکلسن گارڈن کا نام دیا گیا۔

مغل بادشاہوں اور امراء کے بنوائے ہوئے باغوں میں سے چند کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی وسعت یہ اجازت نہیں دیتی کہ ہر مسئلہ کو مفصل طریقہ پر لکھا جائے۔ بہرحال ان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے بالخصوص مغل بادشاہوں نے خوبصورت اور دلکش باغوں سے برصغیر کے مختلف مقامات کو کس طرح اور کس حد تک زینت دی۔ ان میں سے بہت بڑی تعداد ایسے باغوں کی ہے جو آج بھی سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد سیرگاہوں کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

خطّاطی و مُصوّری

(خطاطی و مصوری درحقیقت دو علیحدہ فنون شمار کئے گئے ہیں لیکن مسلمانوں کی فنی تاریخ میں ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اس لئے ان کا ذکر ایک ہی باب میں کیا جاسکتا ہے)۔

مصوری کو اسلام کی ابتدائی نسلیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھیں۔ بت پرستی اسلامی شریعت میں گناہِ عظیم ہے اور اس کی کسی شکل میں بھی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی۔ مصوری اور نقاشی کا بت پرستی سے اس قدر قریبی تعلق ہوگیا تھا کہ اسلام کے دینی پیشوا اس کی مخالفت میں حق بجانب نظر آتے ہیں۔ عیسائی اقوام کے اعلیٰ فنکاروں کے شاہکار اکثر کلیساؤں کی زینت ہی کے لئے وجود میں آئے۔ اسی طرح برصغیر میں ایجنٹا کی نقاشی کو جو مذہبی تقدس حاصل ہے اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ ہزار بارہ سو سال پہلے انسان پر مذہب کا اثر اس قدر زیادہ تھا کہ فنی شاہکاروں کو فن ہی کی دنیا تک محدود رکھنا تقریباً محال تھا۔ ان حالات کے پیش نظر احتیاط کا تقاضہ یہی تھا کہ اس فن کی طرف جو بت پرستی سے رشتۂ تقرب رکھتا ہو توجہ نہ کی جائے۔

بہرحال مسلمانوں نے تصویر کشی سے پرہیز کیا اور ایک مدت تک وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے، لیکن جہاں تک پھول پتیوں یا دوسری بے جان چیزوں کا تعلق تھا وہ زیب وزینت کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔ مصوری کی طرف اس عدم توجہی سے پیدا ہونے والی کمی کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے خطاطی کو ایک فن بنا دیا، اور اس کو اتنی ترقی دی کہ ایک مدت تک اسلامی ممالک میں اس کا مرتبہ مصوری سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اسلام کے عہد عروج میں اسلامی دنیا کی ادبی زبان عربی تھی، اس لئے خطاطی کی بنیادوں کا تعلق اسی زبان سے ہے۔ عربی رسم الخط کی ابتدا کے متعلق مختلف روائتیں ہیں: بہرحال اسقدر یقینی ہے کہ شروع ہی میں عربی خط کے کئی طرز وجود میں آئے، عہد قدیم میں کوفی خط کا رواج تھا یہ اسلام سے دوسو سال پیشتر وجود میں آچکا تھا اور کم وبیش پانچ سو برس تک اس کا رواج رہا۔ خط کوفی دیکھنے میں بہت خوش نما نہیں معلوم ہوتا۔ برخلاف اس کے خط نسخ جو بعد میں رائج ہوا بہت بہتر معلوم ہوتا ہے۔ یہ خط گیارہویں صدی کے اواخر میں انتہائی کمال کو پہنچا۔ اگلی صدی میں ایران میں نستعلیق خط نے رواج پایا[1]۔ جن ممالک میں عربی اور فارسی دونوں زبانوں کا رواج تھا وہاں خط نسخ عربی کے لئے اور نستعلیق فارسی کے لئے استعمال ہونے لگا۔ ہندپاکستان میں ایران کی طرح لوگ کلام پاک اور عربی کی کتابیں نسخ میں اور فارسی کتابیں نستعلیق میں لکھتے تھے۔ شاذونادر ہم کو فارسی کتابیں نسخ میں اور عربی کتابیں نستعلیق میں بھی ملتی ہیں، یہ مستثنیات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہاں چونکہ فارسی دفتری زبان کی بھی حیثیت رکھتی تھی اس لئے نستعلیق نے زیادہ رواج پایا۔ نستعلیق میں خوبی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب حروف کے ٹکڑے اور دائرے اپنی

---

[1] صاحب تذکرہ خوش نویسان نے خط نستعلیق کی ایجاد کے متعلق لکھا ہے:۔

"در زبان امیر تیمور گورگان خواجہ میر علی تبریزی از نسخ و نستعلیق خط ششم را ابداع نمود، کہ آن را نستعلیق نامند"۔ پھر خود ہی ابو الفضل کا قول نقل کرتا ہے کہ یہ روایت قابل قبول نہیں۔

گولائی و تناسب کے لحاظ سے موزوں ہوں۔ اس کے لئے وقت اور مشق دونوں ضروری ہیں اور دفتری کام میں یہ التزامات مشکل تھے۔ چنانچہ دفتری کاغذات میں رفتہ رفتہ نستعلیق نے ایک ایسی شکل اختیار کرلی جو خوشنما تو نہ تھی لیکن جس کے لکھنے میں وقت کی بہت کفایت ہوتی تھی۔ اس خط کو شکستہ کا نام دیا گیا اور اکثر خط دیوانی بھی کہا گیا ہے۔ ہندپاکستان کے بعض علاقوں میں ایک اور طرز کے خط نے رواج پایا تھا لیکن یہ زیادہ مقبول نہیں ہوا اور اس کی عمر بھی زیادہ نہیں ہوئی۔ اس کا نام خط بہار تھا۔

خوش نویسی اعلیٰ سے اعلیٰ طبقوں میں عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ تاریخ کے صفحات الٹنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شہزادے اور حکمران خوش نویسی میں کمال حاصل کرنے کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ سلطان ناصرالدین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اخراجات کے لئے قرآن مجید کے نسخے نقل کرکے روپیہ حاصل کرتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ خوش نویسی میں مہارت حاصل کئے بغیر سلطان کے لئے یہ ممکن نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ لکھنے کا کام اتنا زیادہ کرسکے۔ تاریخ فرشتہ میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"او بادشاہے بود، شجاع و متعبد، کریم، اکثر نفقہ خاصہ خود را
از وجہ کتابت مصحف مجید ساختہ، روزگار خود می گذرانید وا موال
بادشاہی رانفقہ خود اصلا صرف نمی نمود"[1]

دوسرے فنون کی طرح مغلوں کے عہد میں خطاطی نے بھی نمایاں ترقی کی۔ منجملہ اور اسباب کے ایک وجہ اس کی یہ بھی تھی کہ شاہان مغلیہ میں اکثر خود بھی خوش نویس تھے اور خطاطی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ بابر کو اس فن سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اس نے خود ایک خاص خط نکالا تھا جو خط بابری کہلاتا ہے، مورخ بدایونی نے ہم کو بتلایا ہے کہ بابر نے اس خط میں

---

[1] تاریخ فرشتہ۔ مطبوعہ بمبئی۔ جلد اول ص ۱۲۳

کلام مجید لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا تھا[1]۔ اکبر کے عہد میں اس فن کو بہت ترقی ہوئی۔ وہ کہاں تک اس فن کی سرپرستی کرتا تھا، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے بہت سے خوش نویسوں کو اپنے دربار سے منسلک کر لیا تھا، ان کی سرپرستی کرتا تھا اور ان کو گراں بہا انعامات اور خطابات عطا کرتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت محمد حسین کو حاصل ہوئی۔ اس کو زریں رقم کا لقب دیا گیا اور اس کی لکھی ہوئی آئین اکبری جو آج کل برطانیہ میں موجود ہے، خطاطی کا اعلیٰ نمونہ تسلیم کی گئی ہے۔ زریں رقم کے علاوہ ابوالفضل نے اور بھی متعدد خوش نویسوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً میر معصوم قندھاری کاتب الملک عنبریں رقم۔ اشرف خان، راؤ موہن اور ٹوڈرمل وغیرہ[2] عبدالصمد کو شیریں رقم کا خطاب دیا گیا تھا۔ اس کے کمال کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ اس نے قل ہو اللہ شریف مع بسم اللہ کے خشخش کے دانہ پر لکھی تھی[3]۔ دربار اکبری سے منسلک خوش نویسوں کی تعداد کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں شاہی کتب خانہ میں چوبیس ہزار مخطوطے تھے۔ صاحب ذخیرۃ الخوانین نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ابوالفضل کے یہاں چالیس کتاب قرآن شریف نقل کرنے پر مامور تھے[4]۔

اپنے اجداد کی طرح جہانگیر نے بھی خطاطی کی سرپرستی کی۔ اس کے زمانہ میں اور اس کی کی فیاضی اور بلند ذوقی سے فائدہ حاصل کرنے والے خوش نویسوں میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جا سکتا ہے۔ میر عبداللہ تبریزی جن کو اکبر نے مشکیں رقم کا خطاب دیا تھا دربار جہانگیری سے منسلک رہے۔ ان کی وفات ۱۶۲۵ء میں ہوئی۔ ان کے کمال کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے

---

[1] منتخب التواریخ۔ ص ۹۲

[2] دیکھو آئین اکبری۔

[3] بلاک مین کا ترجمہ آئین اکبری۔ جلد اول۔ صفحہ نمبر ۲۶۶

[4] ذخیرۃ الخوانین۔ جلد اول ص ۷۲ ابوالفضل کی بے دینی کے پیش نظر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کہ وہ سات مختلف قسم کے خط لکھتے تھے[۲]۔ مرزا محمد حسین ایران سے آئے تھے اور بعد میں دربار اکبری سے منسلک ہو گئے تھے، صاحب تذکرہ خوش نویسان لکھتا ہے:

"خط تعلیق، نستعلیق وثلث را بغایت خوب می نوشت، وخط شکستہ پیش از ین ضابطہ واسلوبے مقرر نداشت، در خطوط مذکور شمردہ نمی شد - مرزا محمد حسین این خط خوش نوشت، وبدرجہ کمال میانید[۳]"

شاہجہان کو خطاطی سے بہت دلچسپی تھی، وہ اچھے خوش نویسوں کی سرپرستی کرتا۔ اس کی دلچسپی کی سب سے عمدہ شہادت یہ ہے کہ خود اس کے لڑکے اس فن کے ماہر تھے، دارا اور اورنگ زیب دونوں بہت اچھے خوش نویس تھے، شاہجہانی عہد کا سب سے مشہور خوش نویس آقا عبد الرشید دیلمی تھا، وہ ایران کے مشہور خطاط میر عماد کا بھانجا تھا، اس کو "ملک خطاطی کا پیغمبر" کہا گیا ہے، اس کے علاوہ اور خوشنویسوں کا بھی ذکر ملتا ہے، عالمگیر بھی اس فن کی سرپرستی کرتا تھا، عبد الباقی حداد کو اس نے یاقوت رقم کا خطاب دیا، لیکن وہ آخر میں یہاں سے اپنے وطن ایران واپس چلا گیا۔ سید علی خان جواہر رقم، ہدایت اللہ زرین رقم، میر محمد باقر، میر محمد زاہد وغیرہ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے[۳]۔

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) اس روایت کو قبول کرنے میں توقف ہے۔ لیکن واضح روایت یہ ضرور کہتا تھا کہ ابو الفضل کے یہاں کاتبوں کی ایک تعداد مصروف کتابت رہتی ہے۔

[۱] مشکین قلم

[۲] تذکرہ خوشنویساں ص ۱۰۴ مرزا محمد حسین کی تاریخ وفات تذکرہ میں غلط چھپ گئی ہے"؛ تذکرہ کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ہزار وبیست وشش کی جگہ ہزار وشش چھپ گیا ہے۔

[۳] مزید تفصیلات کے لئے دیکھو ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلد (شائع کردہ دار المصنفین۔ اعظم گڑھ۔ ۱۹۶۳ء) ۳، ۳۱ وغیرہ

مصوّری

اکبری عہد

مصوری صحیح معنوں میں یہاں مغلوں کے عہد میں شروع ہوئی۔ ان سے پہلے مخطوطات مزین ضرور کئے جاتے تھے اور تصویریں بھی بنائی جاتی تھیں[۱] لیکن یہ طریقے بہت زیادہ رائج نہ ہو سکے فتوحات فیروز شاہی میں ان کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے جو ترویج شرع اور شعائر اسلام کو رواج دینے کے سلسلہ میں سلطان نے انجام دیئے۔ ان میں سے ایک کا ذکر وہ یوں کرتا ہے:

"درایام سابقہ رسم و عادات برین بود کہ جا جا مصوری کردند وبروجہ تشریف از درگاہ سلاطین مردم را می پوشانیدند و ہم چنین برلگام و زین و قلادہ مرکب و مجمرہائے عود و در طاس و قدح و کوزہ و طشت و آفتابہ و در خیمہا و پردہا و تخت و کرسی و سائر آلات و

---

[۱] مخطوطہ فتوحات فیروز شاہی ۱۴۵

ادوات، صورت می نگاشتند و تمثال می داشتند۔ بہ ہدایت ربانی
وعنایت سبحانی گفتیم جملہ صورت تمثال از جمیع این چیزہا دور کنند و انچہ
محظور شرع نیست و جائز و مباح است بسازند بصورت و تماثیل کہ از
دار و قصور تصویر می کردند فرمودیم تا جملہ را محو کنند[1]:

یہ الفاظ جس دینی جذبہ کے تحت سپرد قلم کئے گئے ہیں وہ ان سے صاف ظاہر ہے لیکن ایک مورخ کے نزدیک یہ اس لئے بھی اہم ہیں کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چودھویں صدی کے نصف اول میں یہاں مصوری اور تمثیل کشی کا رواج ہو چلا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اشارہ اس میں موجود ہے کہ شریعت کی نظر میں یہ مباح نہیں سمجھا جاتا تھا۔ فیروز شاہ کے بیان کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ التمش کے عہد میں خلیفہ بغداد کے سفیر کی آمد کے موقع پر شہر کو سجایا گیا تو دیواروں پر تصویریں بھی بنائی گئی تھیں۔ ایک ہم عصر شاعر نے اس کی طرف اپنے قصیدے میں اشارہ کیا ہے:

"خسروا از رشک صورہا کہ بر ایوان کشت
چین دو ابروئے نکو رومان چین آوردہ اند[2]"

لیکن یہ طریقے بہت زیادہ رائج نہ ہو سکے۔ کیوں کہ اس کی ابتدا غالباً تیرھویں صدی سے پہلے نہیں ہوئی ہوگی۔ بہرحال مشہور مصور کتابوں میں جو عجائب گھروں یا کتب خانوں میں محفوظ ہیں مقامات حریری کے اس نسخہ کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے جو فرانس میں ببلیوتھک نیشنال میں موجود ہے اس کی تاریخ کتابت بارہ سو سینتیس عیسوی ۱۲۳۷ء ہے۔ بیس سال بعد بغداد پر وہ تباہی آئی جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے علمی، ادبی، فنی اور تہذیبی کارناموں کے اکثر جواہر پارے نذر آتش ہو گئے

---

[1] دیکھو اسمتھ۔ اکبر دی گریٹ مغل (دہلی) ۳۱۰۴

[2] بحوالہ بزم مملوکیہ ص ۱۰۵۔

یعنی ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ کیا۔ تاتاریوں کے اسلام قبول کرنے اور منگولوں کے ہاتھوں اسلامی تمدن کے دوبارہ عروج میں ایک صدی سے زیادہ عرصہ لگا اس لئے کہ تیمور اور اس کے جانشینوں نے اسلامی تمدن اور تہذیب کو دوبارہ رونق بخشی۔ ان ہی کی سرپرستی میں مصوری نے بھی ترقی کی چنانچہ مشرق کے مشہور مصور کمال الدین بہزاد کا سرپرست تیمور ہی کا پوتا، حسین بیقرہ تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغلیہ سلطنت کے بانی، بابر بادشاہ نے یہ ذوق ورثہ میں حاصل کیا۔ اس وقت تک مسلمانوں نے فن مصوری میں خراسان اور قرب و جوار کے دوسرے علاقوں میں اپنی روایات قائم کر لی تھیں۔ بابر کو اس فن سے کسی قدر دلچسپی تھی اس کی شہادت تزک بابری میں موجود ہے۔ لیکن برصغیر میں مصوری کو عروج اس وقت سے ہوا جب ہمایوں بادشاہ کی جلو میں ایران سے مشہور ماہرین فن یعنی میر سید علی و عبدالصمد یہاں آئے۔ فنی صلاحیت کے علاوہ ان کی شہرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بچپن میں اکبر کو ان ہی کی شاگردی میں دیا گیا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں تو اس نے کچھ ترقی نہیں کی لیکن نقش و نگار کی تھوڑی بہت مشق ضرور ہوگئی۔ ابتدائی عہد کی ہند پاکستان میں تیار ہونے والی مشہور تصاویر عبدالصمد ہی کی ہیں اور اس لحاظ سے بعض محققین نے ہند پاکستانی فن مصوری کا بانی اسی کو کہا ہے۔

اکبر اور فن مصوری

اکبر کے عہد میں اس فن نے بہت ترقی کی۔ اس کو فنون سے بالعموم اور مصوری سے خاص طور پر دلچسپی تھی اور اس کی سرپرستی میں وہ کسی بھی حد تک جانے کے لئے تیار تھا۔ جب ابوالفضل نے دیکھا کہ اس کے آقائے نامدار کو اس فن سے غیر معمولی دلچسپی ہے تو اس کے لئے اس نے ایک جواز کی صورت پیدا کی۔ تاکہ مسلمان معترضین کا منہ بند کرسکے۔ اکبر کی زبانی آئین اکبری میں مصوری کی خصوصیات اور فوائد کا اشارہ اس طرح کیا گیا ہے کہ بادشاہ کہتا ہے کہ بہت سے لوگ مصوری سے نفرت کرتے ہیں، میں ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا میرا خیال ہے کہ مصور خدا کی معرفت ایک مخصوص

طریقہ سے حاصل کرتا ہے، جب وہ کسی جاندار کی تصویر تیار کرتا ہے اور یکے بعد دیگرے اس کے مختلف اعضا بناتا ہے تو اس کو خیال پیدا ہوتا ہے کہ باوجود اپنے کمال و کوشش کے وہ اس کو جان اور شخصیت نہیں بخش سکتا۔ اس ناکامی سے لازمی طور پر اس کو خداوند تعالیٰ کی خالقیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور اس کا علم خدا کی ذات کے متعلق بڑھ جاتا ہے[1]۔ بہرحال اکبر نے بڑی تعداد میں مصوروں کو دربار سے منسلک کیا اور ابوالفضل نے سو سے زیادہ نام درباری مصوروں کے گنائے ہیں جن میں سترہ بہت نمایاں اور باکمال سمجھے گئے ہیں[2]۔ اکبر کے زمانہ کی تصویروں کے دو مجموعے قابل ذکر ہیں۔ داستان امیر حمزہ کے واقعات اور قصوں کو مصور کرنے کا فرض تقریباً پچاس مصوروں کے سپرد کیا گیا۔ ان کی نگہبانی اور دیکھ بھال میر سید علی اور خواجہ عبدالصمد کے ذمہ تھی۔ ان مصوروں نے جو دو ہزار کے قریب تصویریں تیار کیں ان میں سے بعض ساوتھ کینسنگٹن اور برٹش میوزیم میں موجود ہیں[3]۔ دوسرا مجموعہ اکبر نامہ کی تصاویر کا ہے ان میں سے بھی کچھ ساؤتھ کینسنگٹن میں موجود ہیں۔ ان تصاویر

---

[1] اکبر (یا درحقیقت ابوالفضل) کی یہ دلیل مصور سے زیادہ بت تراش کے لئے پیش کی جاسکتی ہے۔ (آئین - ترجمہ انگریزی از بلاک مین ص ۱۱۵)

[2] اسمتھ صاحب کا خیال ہے کہ ساوتھ کینسنگٹن میں اکبر نامہ کا جو مصور نسخہ موجود ہے اس کی تصاویر سے عہد اکبری کے مشہور فن کاروں کے کمال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بہرحال انہوں نے ان میں سے کئی شاہکاروں کا مطالعہ کیا ہے۔

[3] اکبر کے عہد میں اور اس کی خواہش پر فارسی کے بعض مشہور ادبی اور تاریخی کتابوں کو مصور کیا گیا مثلاً بابر نامہ، شاہ نامہ، دارا نامہ، خمسہ نظامی اور انوار سہیلی۔

کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے ان میں اس زمانہ کی زندگی کے مختلف شعبوں کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً بادشاہ، شہزادوں، درباریوں اور امراء کے علاوہ جانوروں کی تصویریں شکار کے مناظر، کھیتوں میں کسانوں کا کام کرنا، چراگاہوں میں چرواہوں کا اپنی بھیڑوں کی نگہبانی میں مشغول ہونا، معماروں کا عمارتیں بنانا، یہ سب مناظر موجود ہیں۔ ناچ اور گانے کی محفلیں پہلوانوں کی کشتیاں اور محفلوں کے اندر کی زندگی کے نمونے بھی ملتے ہیں[۱]۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کس قدر کم مدت میں اس فن نے اکبر کی سرپرستی میں مقبولیت حاصل کرلی عمارتوں کی دیواروں پر نقاشی اور مصوری کے سلسلہ میں فتحپور سیکری کے بعض حصوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ یہ تصاویر اب بھی موجود ہیں۔ اگرچہ بعض کو تقریباً از سرِ نو مکمل کیا گیا ہے۔

جہانگیر

جہانگیر کو اپنے باپ سے بھی زیادہ اس فن سے دلچسپی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے عہد میں مغلوں کا فن مصوری اپنے انتہائی کمال کو پہنچا جہانگیر کو اس پر ناز تھا کہ وہ اس فن سے بہت زیادہ واقف تھا اور تصویر کے حسن و قبح کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ سر طامس رو نے اس سلسلہ میں جس دلچسپ واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ جہانگیری دور کے مصور اپنے پیش رؤں کے مقابلہ میں فنی نقطہ نظر سے یقیناً زیادہ باکمال تھے۔ تصاویر کے رنگوں میں بھی نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ جہانگیر کے عہد کی تصویروں میں رنگ زیادہ چمکدار ہیں مصوروں[۲] کا ذوق بھی بہتر نظر آتا ہے۔ جہانگیر کو قدرتی مناظر، پرندوں اور جانوروں سے بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس کے مصوروں نے اس طرف

---

[۱] تصاویر کے لئے دیکھو مغل پینٹنگ فار گیلری آف اورینٹل آرٹ مع مقدمہ از جے۔ وی۔ ایس ولکنسن (لندن۔ ۱۹۴۸ء)

[۲] جہانگیر اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے: "ہمچنیں اوستاد منصور نقاش کہ بہ خطاب نادر العصر ممتاز است دور فن نقاشی یگانۂ عصر خود است" (تزک ص ۲۳۵)

کافی توجہ دی ہے۔ استاد منصور کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کی تیار کی ہوئی بعض تصاویر موجود ہیں[1] لیکن سب سے زیادہ ترقی انسانی شکل کی تصویریں بنانے میں ہوئی اور مغل مصوری کی یہ ایک نمایاں اور مستقل خصوصیت بن گئی۔ فن کی ترقی میں جہانگیر کا بہت بڑا حصہ ہے، اس کا اندازہ نہایت آسانی سے توزک جہانگیری کی ان عبارتوں سے لگایا جا سکتا ہے جہاں وہ نہایت شوق کے ساتھ مختلف ماہرین کے شاہکاروں کا ذکر کرتا ہے۔ جلوس کے تیرہویں سال کے واقعات کے سلسلہ میں لکھتا ہے!

"دریں تاریخ ابوالحسن مصور بخطاب نادرالزماں سرفراز گشت
جلوس مرا در دیباچہ جہانگیر نامہ کشیدہ بہ نظر در آورد، چوں سزاوار
تحسین و آفرین بود مورد الطاف بے کراں گشت، کارش بہ عیار کامل
رسیدہ و تصویر او از کارنامہائے روزگار است، دریں عصر نظیر
و عدیل خود نہ دارد۔ اگر دریں روز او استاد عبدالحئی و اوستاد
بہزاد در صفحہ روزگار می بودند انصاف کار او می دادند"،

اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ شاہ عباس صفوی کی طرف سے خان عالم بحیثیت سفیر آیا تو وہ اپنے ہمراہ ایک تصویر لایا جس کو جہانگیر "از نفائس و نوادر روزگار" کہتا ہے یہ امیر تیمور کی ایک جنگ کی تصویر تھی جس میں چوبیس آدمیوں کی شکلیں تھیں اور سب کے نام بھی لکھے ہوئے تھے۔ مصور نے اپنا نام خلیل مرزا شاہرخی لکھا تھا۔ جہانگیر کی رائے میں"

"کارش بغایت پختہ و عالی است و بقلم اوستاد بہزاد مناسبت

---

[1] توزک جہانگیری ص ۲۳۵

ابوالحسن کا شاہکار "چنار کا درخت" انڈیا آفس کے جانسن البم میں موجود ہے۔

ومشابہت تمام دارد۔ اگر نام مصور نوشتہ نبودے گمان می شد کہ کار بہزاد باشد وچوں بحسب تاریخ او پیشتر است اغلب ظن آنکہ بہزاد از شاگردان اوست و بروش او متفق گشتہ" یہ تصویر صفویوں کے شاہی کتب خانہ میں تھی۔ وہاں کے کتاب دار نے چرا کر اس کو فروخت کر دیا۔ اتفاق سے اصفہان میں خان عالم کے ہاتھ آگئی۔ اس کی خبر جب شاہ کو ہوئی تو اوس نے دیکھنے کے لئے خان عالم سے منگوالی لیکن "چونکہ توجہ خاطر مارا باشال ایں نفائس می دانند کہ درچہ مرتبہ است .... حقیقت را بہ خان عالم ظاہر ساختہ باز بہ مشار الیہ لطف نمودند" [1]

یہ چند اقتباسات مثال کے طور پر یہاں نقل کر دیئے گئے۔ ورنہ مصوری اور مصوروں کے کمالات کے متعلق جہانگیر نے اپنے خیالات کا اظہار تزک میں کئی مقامات پر کیا ہے۔

مصوری، شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد میں

شاہجہان کی پہلی دلچسپی عمارت تھی، لیکن مصوری سے بھی اس کو لگاؤ ضرور تھا۔ چنانچہ اس فن نے اس کی سرپرستی میں صرف اس کا پرانا معیار قائم ہی نہیں رکھا بلکہ اس کو بلند کر دیا۔ شاہجہان کی ذاتی دلچسپی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ شاہنامہ کے اس شہرہ آفاق نسخہ پر جو بابر اپنی ہمراہ ہرات سے لایا تھا اس نے اپنے جلوس کے پہلے ہی روز لکھا کہ آج یہ شاہنامہ ہمیں ذاتی کتب خانہ میں داخل کیا گیا۔ اس دور میں ہم کو انسانی تصویر میں بعض نمایاں اور بہتر خصوصیات نظر آتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ

---

[1] توزک جہانگیری ص ۲۸۵

[2] ولکنسن ۵۴

انسانی تصویر اب انتہائی اوج کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ شہزادوں، امرا اور درباریوں کی نہایت کثرت سے تصاویر تیار ہوئیں جن میں ہم مکمل درباری پوشاک دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ مشائخ کی تصاویر بھی تیار کی گئیں۔ فن کے لحاظ سے بھی ان کا معیار بلند ہے۔ نزاکت کا عنصر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے[۱]۔

عالمگیر کے زہد و اتقا کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ مصوری کی زیادہ حوصلہ افزائی نہ کرتا لیکن وہ اس قدر تنگ نظر نہ تھا کہ فنون لطیفہ کی، بحیثیت فنون کے بھی سرپرستی نہ کرتا۔ ایک مغربی ماہر، سر پرسی براؤن نے واقعات اور ان تصاویر کی بنیاد پر جو آج بھی کسی نہ کسی البم میں موجود ہیں یہ رائے قائم کی ہے کہ عالمگیر کے عہد میں بھی یہ فن اپنے معیار پر قائم رہا۔ عالمگیر کے زمانہ کی اور خود عالمگیر کی اتنی تصویریں موجود ہیں کہ ان کے پیش نظر یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ عالمگیر کا عہد اس فن کے لئے سازگار نہ تھا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اب وہ صرف فن کی حیثیت رکھتا تھا۔ بادشاہ کے ذاتی شوق کو اس سے تعلق نہ تھا۔ فرانسیسی سیاح برنیئر[۲] نے فنکاروں کی جس زبوں حالی کا ذکر کیا ہے وہ درحقیقت معمولی نقاش ہوں گے جو نہ اپنے فن میں ماہر تھے اور نہ اس قدر خوش نصیب تھے کہ ان کے کارناموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ ہم کو یہ امر بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ برنیئر اور دوسرے سیاح بہت محدود معلومات، بلکہ بعض اوقات ایک دو واقعات کی بنیاد پر مبالغہ آمیز نتائج مرتب کر لیتے ہیں۔ بہرحال مغلوں کے دور

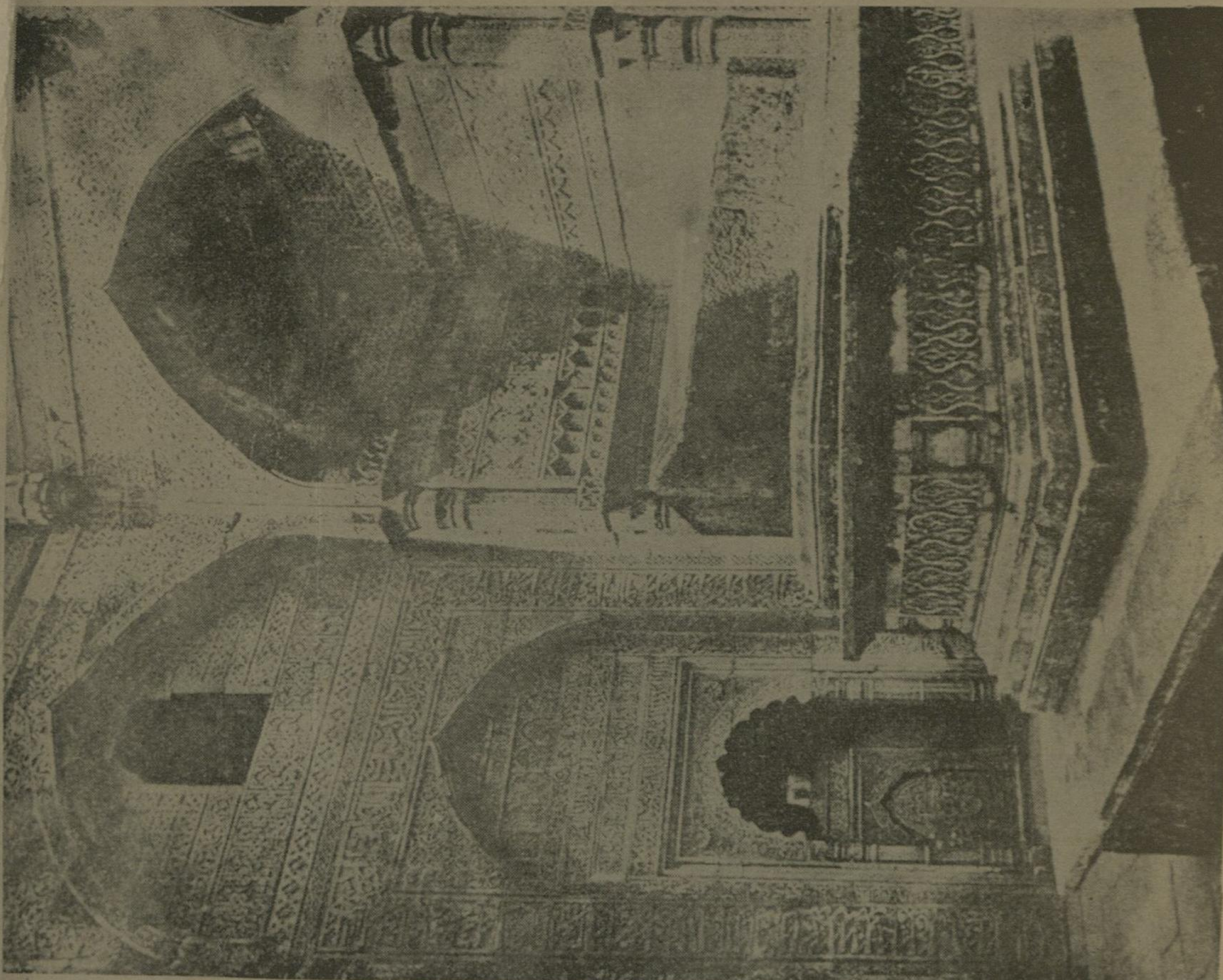
---

[۱] جہانگیر اور شاہجہان کے عہد کی بعض مشہور تصاویر جن میں بادشاہوں کے علاوہ امرا اور مناظر کی تصاویر بھی شامل ہیں، وکٹوریہ اور البرٹ میوزیم لندن کے جہانگیر کلکشن میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

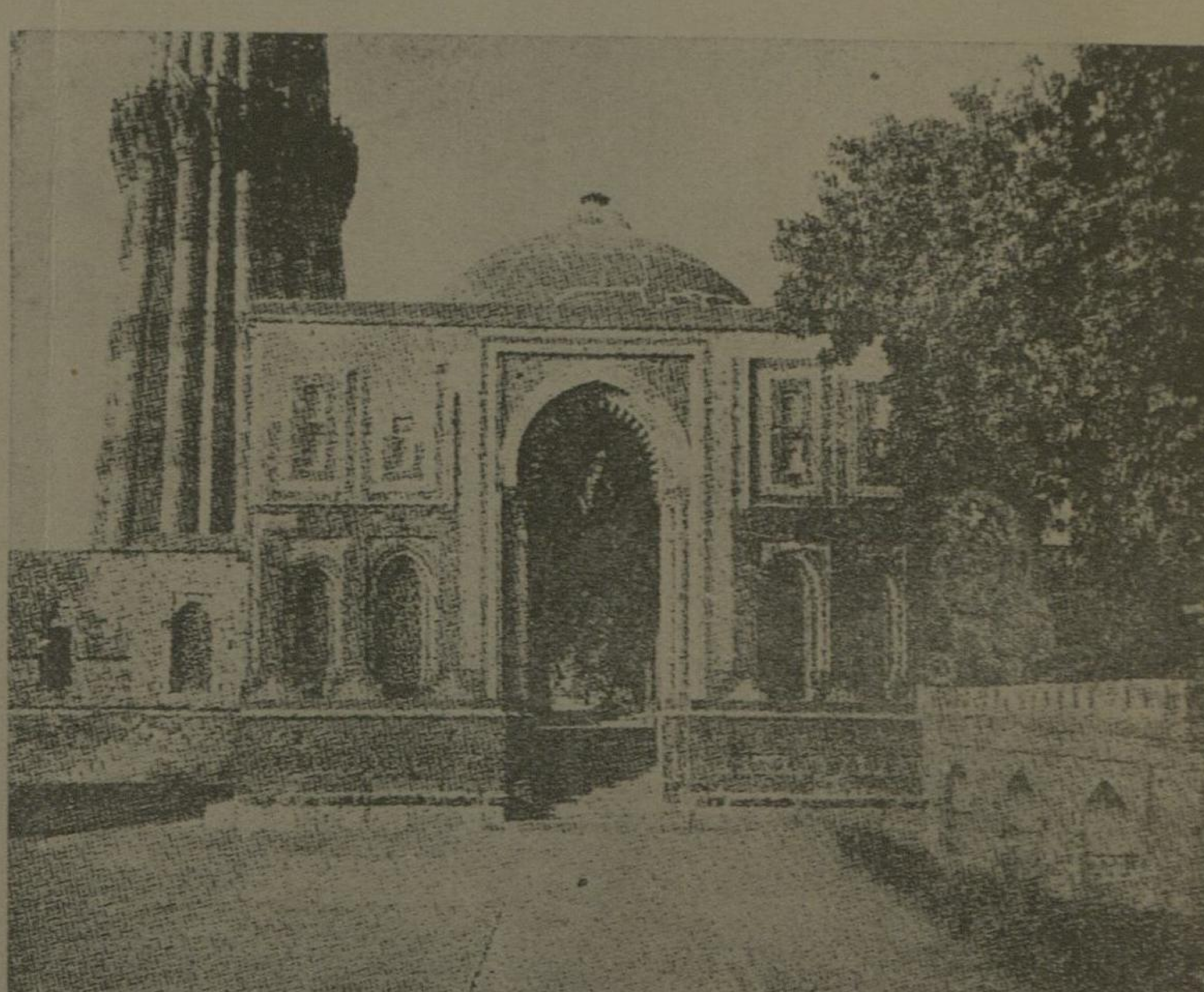
[۲] برنیئر ۲

میں فن تعمیر کی طرح فن مصوری نے بھی بہت زیادہ ترقی کی اور اپنی مخصوص حیثیت اور معیار قائم کر لیے۔ آج اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ہند پاکستان میں مغل مصوری کو سب سے زیادہ بلند پایہ تصور کی جاتی ہے اس کی دوسری شاخیں مثلاً راجپوت اسکول وغیرہ صرف اس سے متاثر ہی نہیں ہوئیں بلکہ اس معیار تک بھی نہ پہنچ سکیں۔

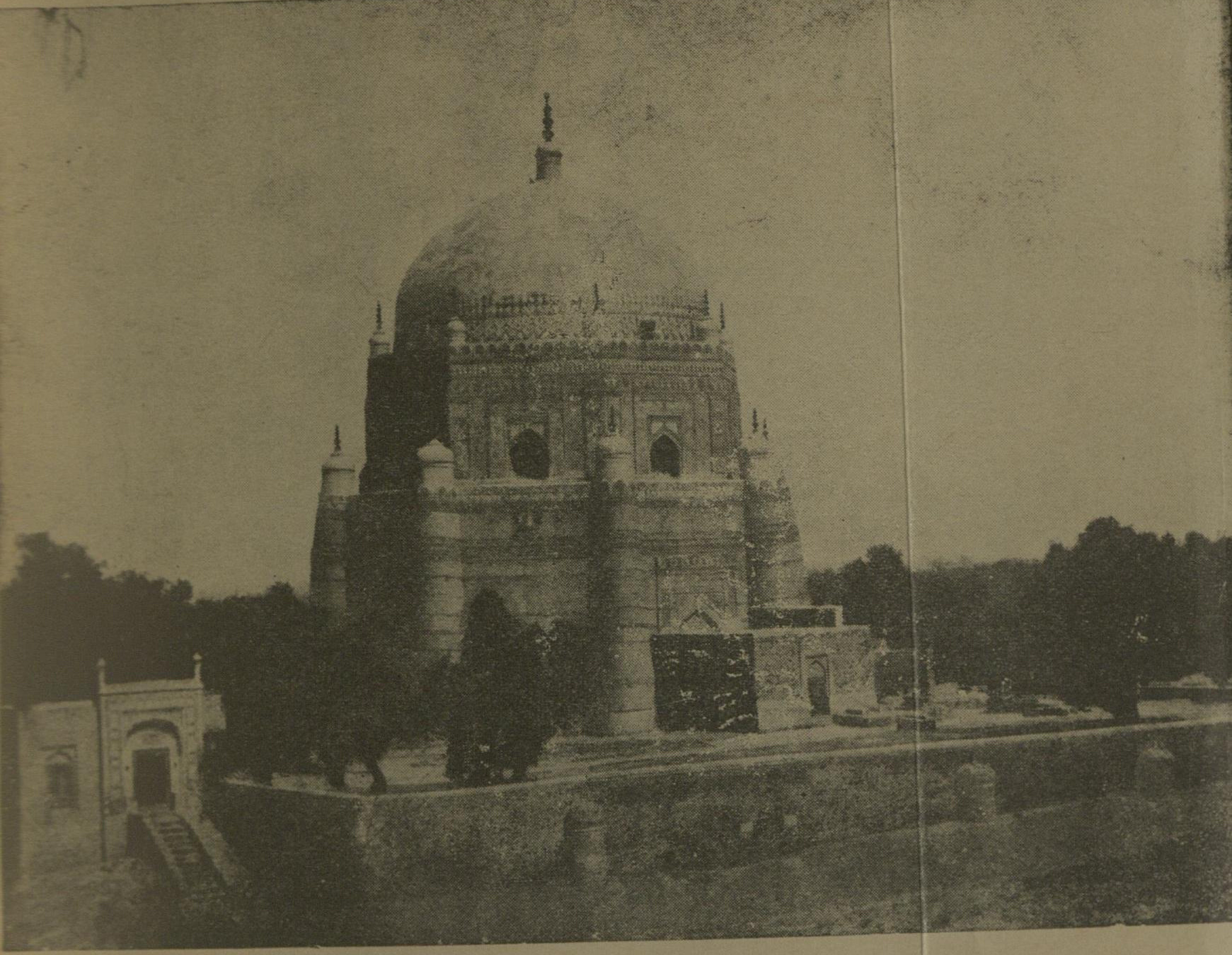
انٹرنیشنل پریس کراچی



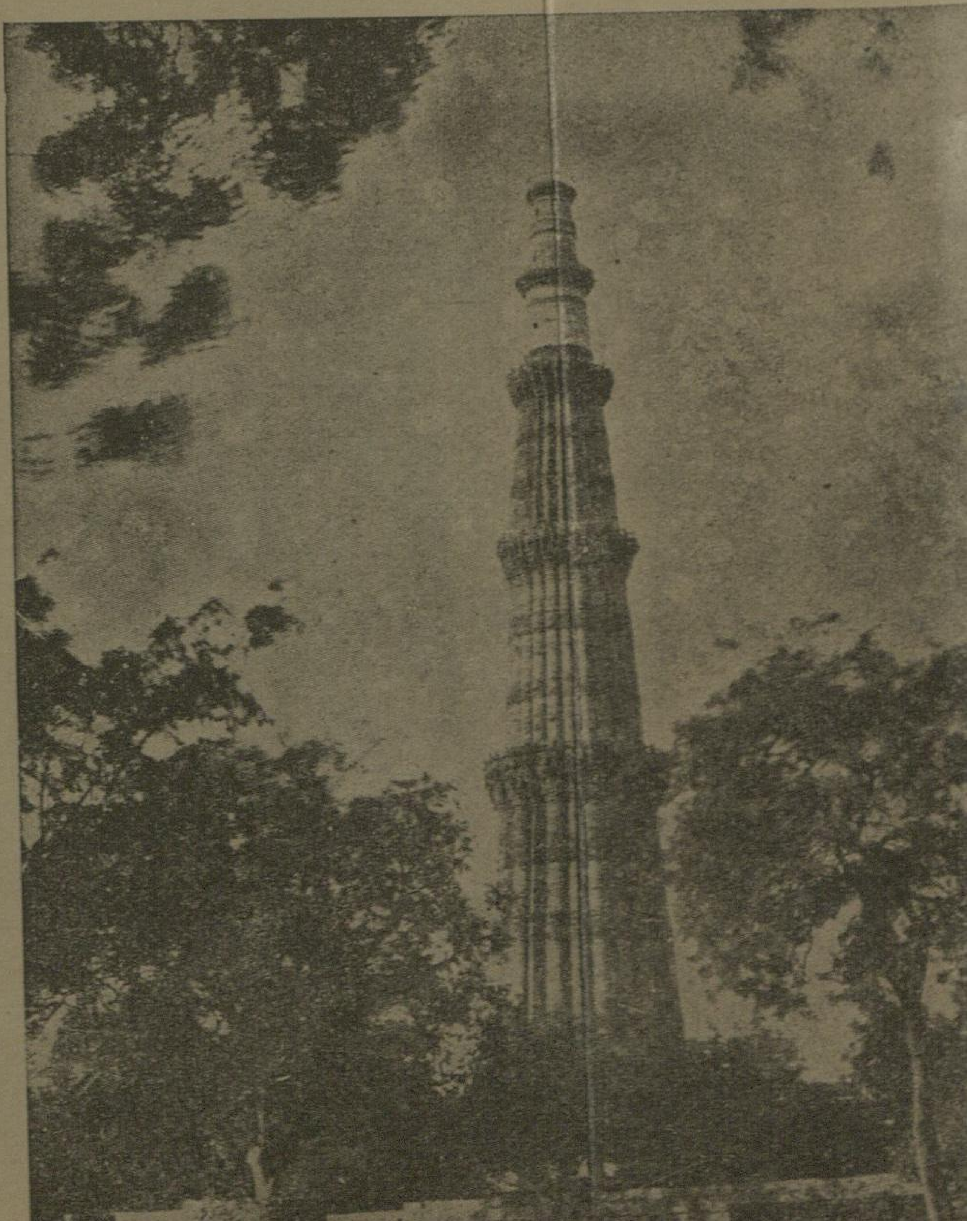
مقبرہ التتمش،
متعلق صفحہ ۸



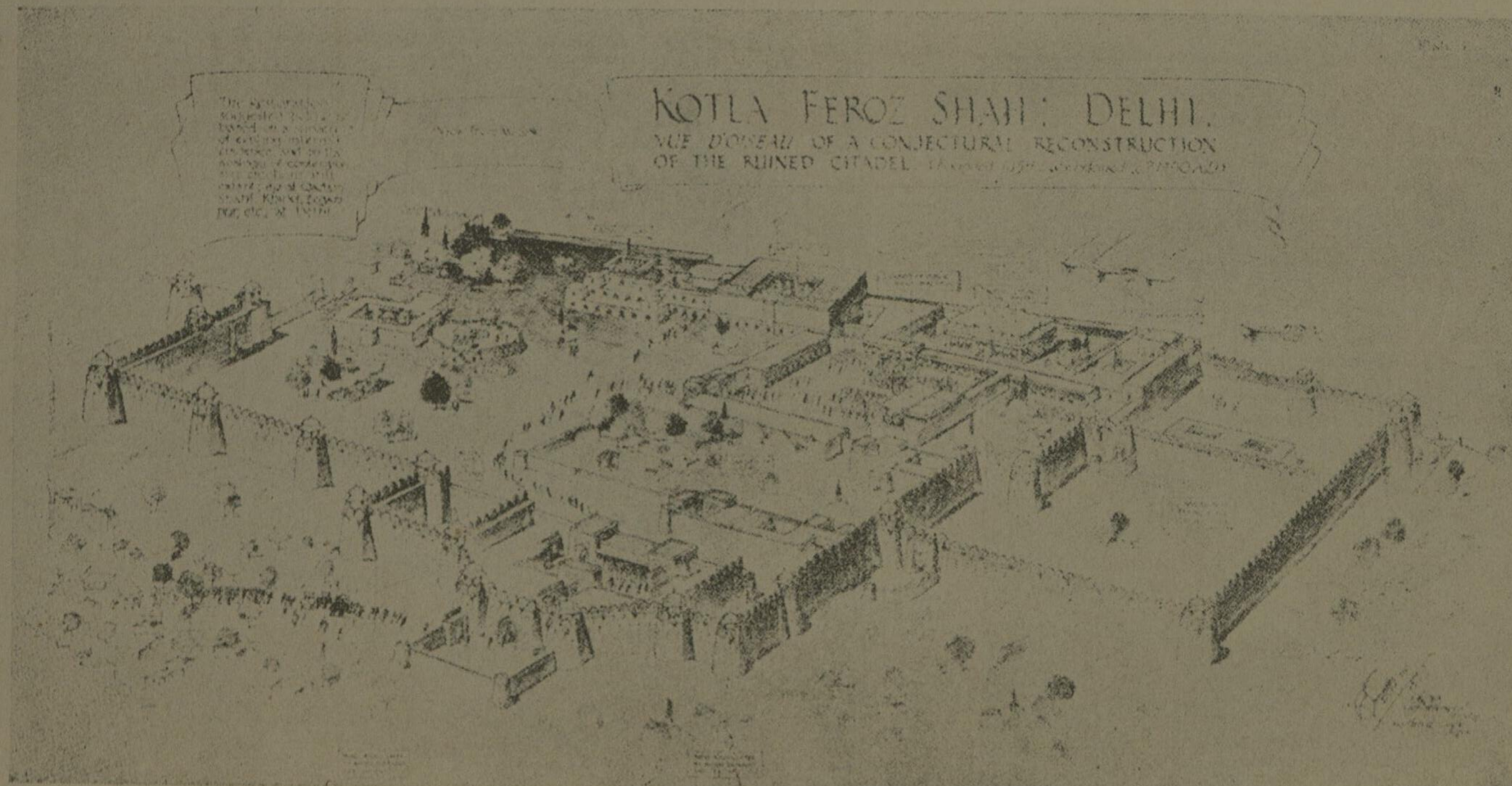
علائی دروازہ
(دہلی)
متعلق صفحہ ۹



مقبرہ شاہ رکن عالم (ملتان)
متعلق صفحہ ۱۷



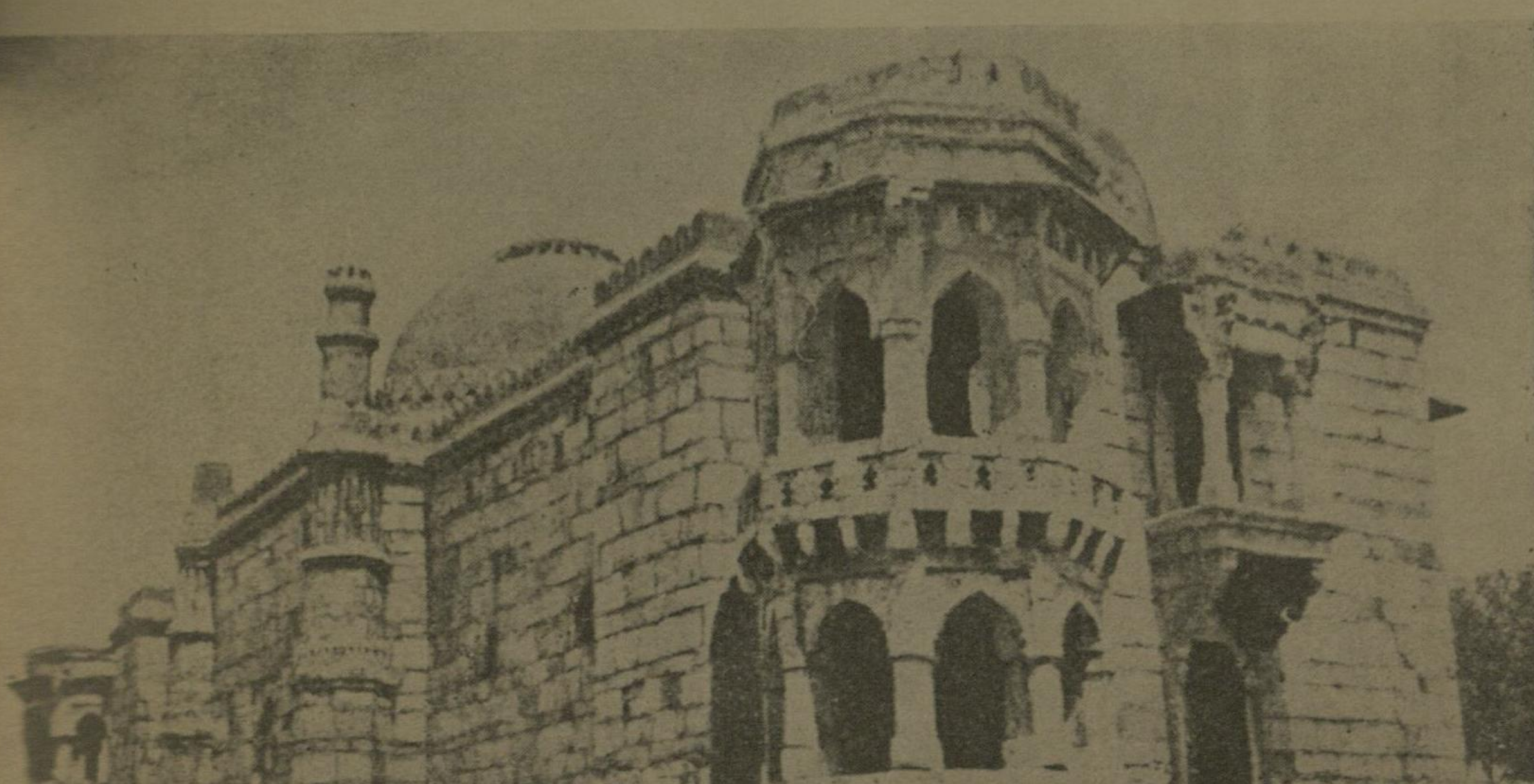
قطب مینار (دہلی)
متعلق صفحہ ۵



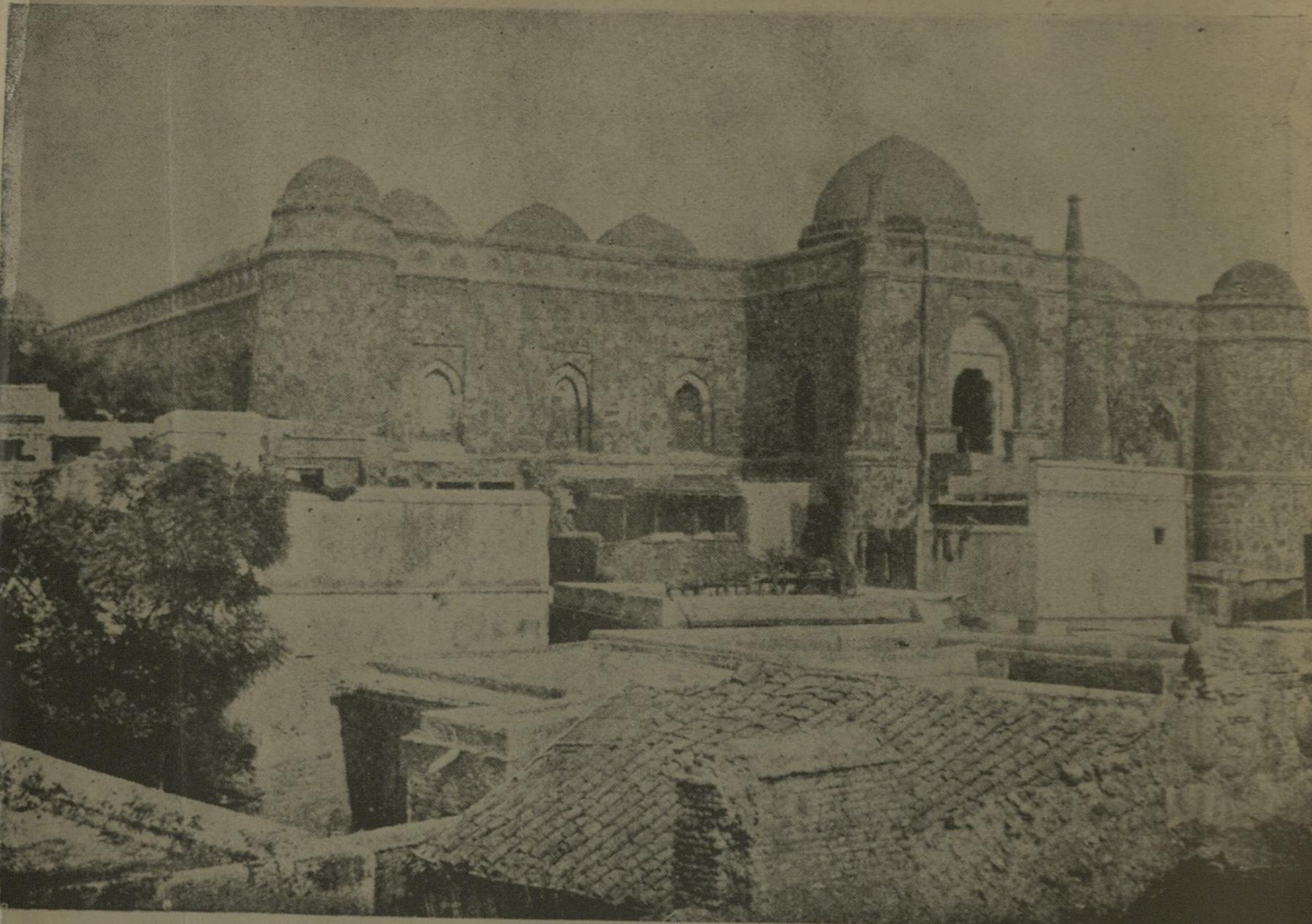
کوٹلہ فیروز شاہ (دہلی) متعلق صفحہ ۱۳



مقبرہ فیروز شاہ تغلق متعلق صفحہ ۱۴



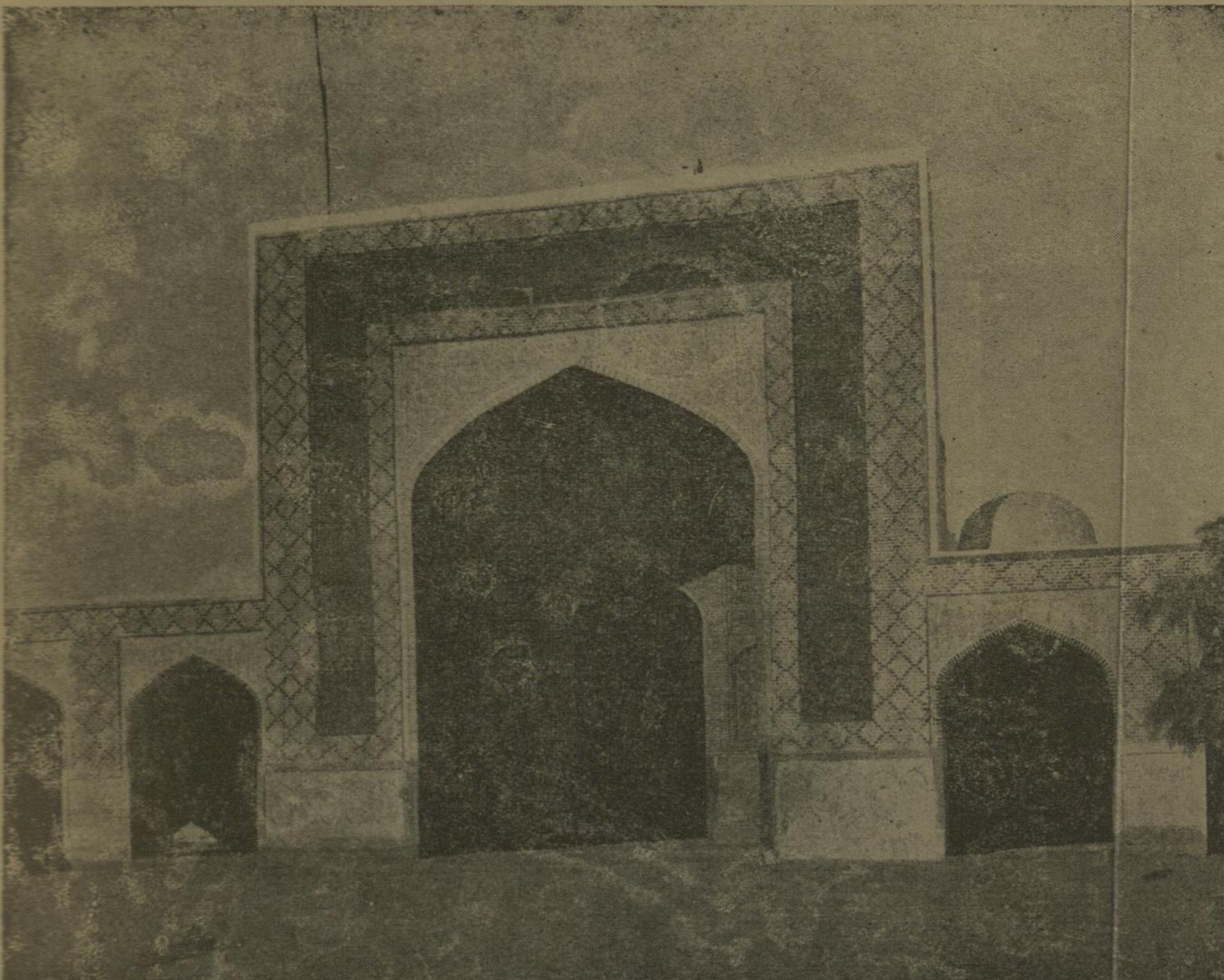
موٹھ کی مسجد دہلی متعلق صفحہ ۱۶



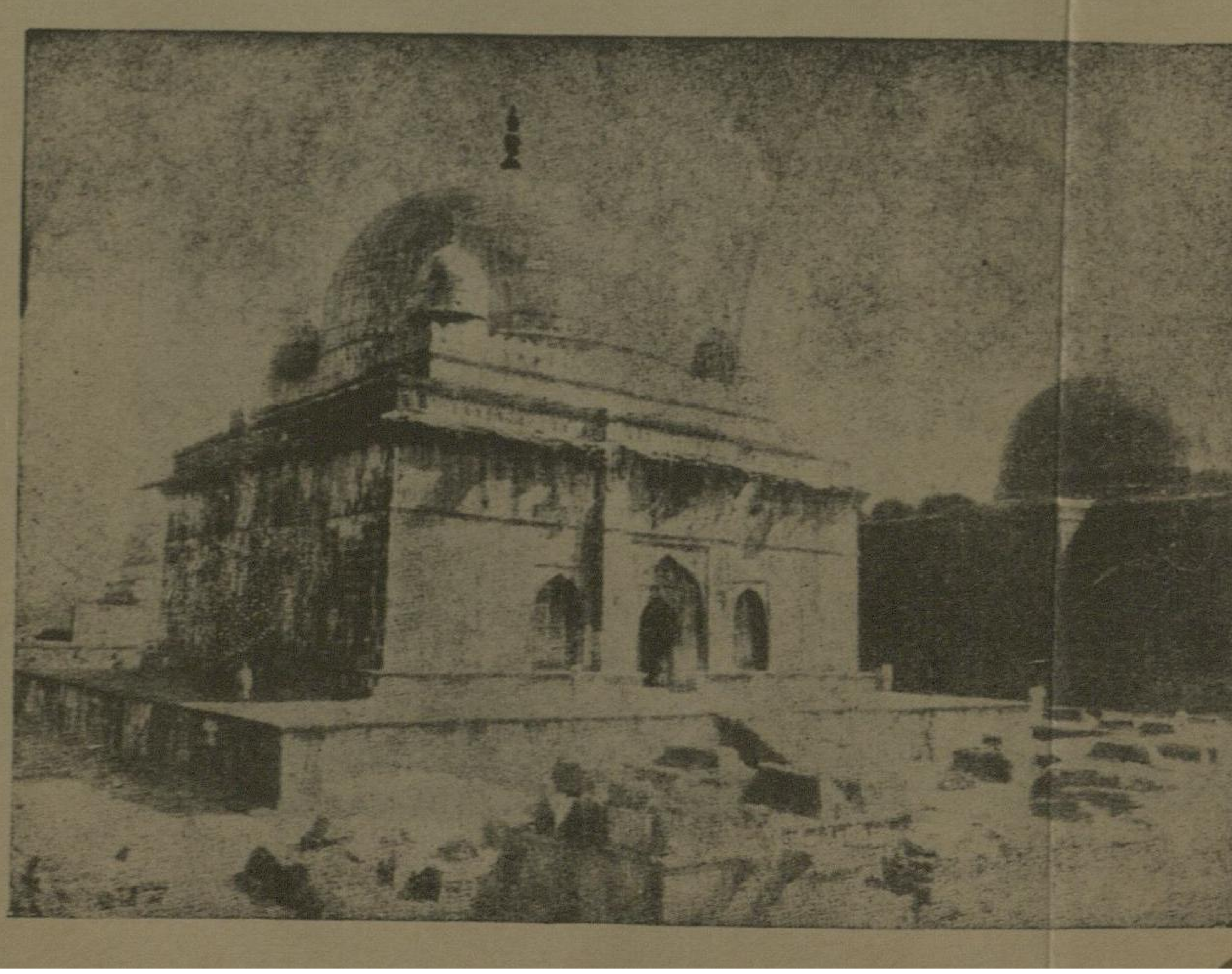
کلاں مسجد (عہد فیروز شاہ) دہلی متعلق صفحہ ۱۴



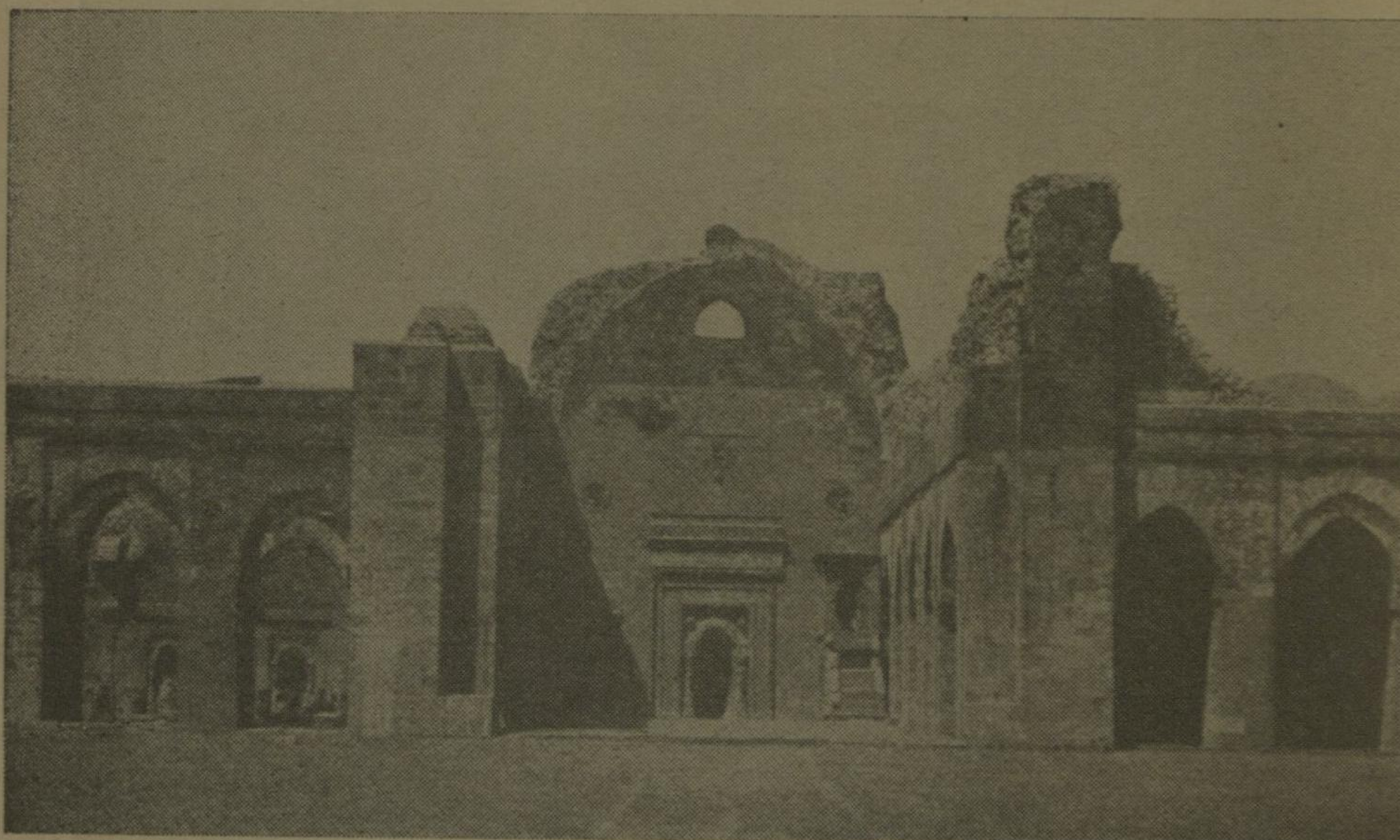
مقبرہ و مدرسہ
فیروز شاہ
نزد حوض علائی (دہلی)
متعلق صفحہ ۱۰



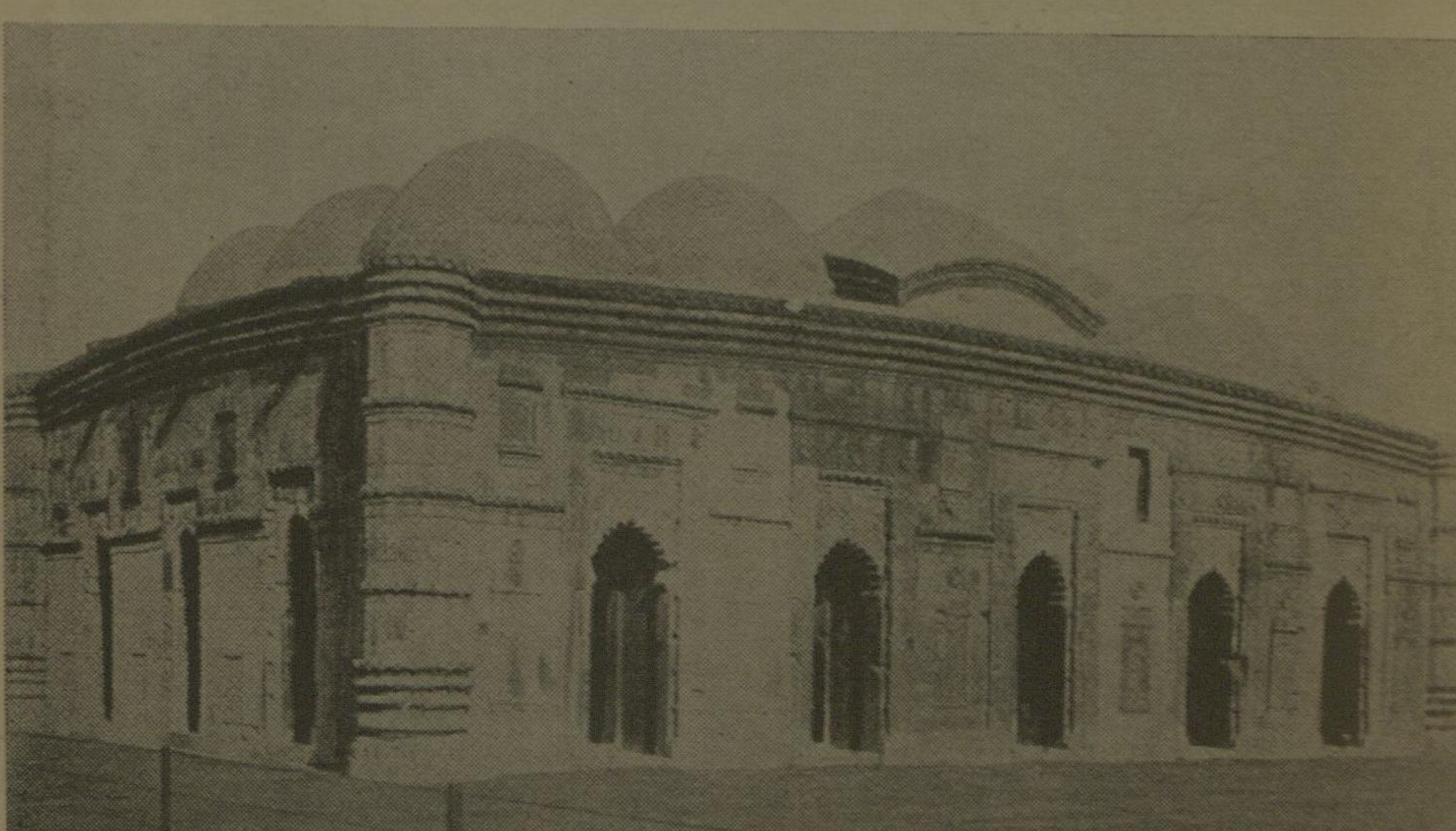
جامع مسجد (ٹھٹہ) متعلق صفحہ ۵۴



مقبرہ ہوشنگ
متعلق صفحہ ۲۵



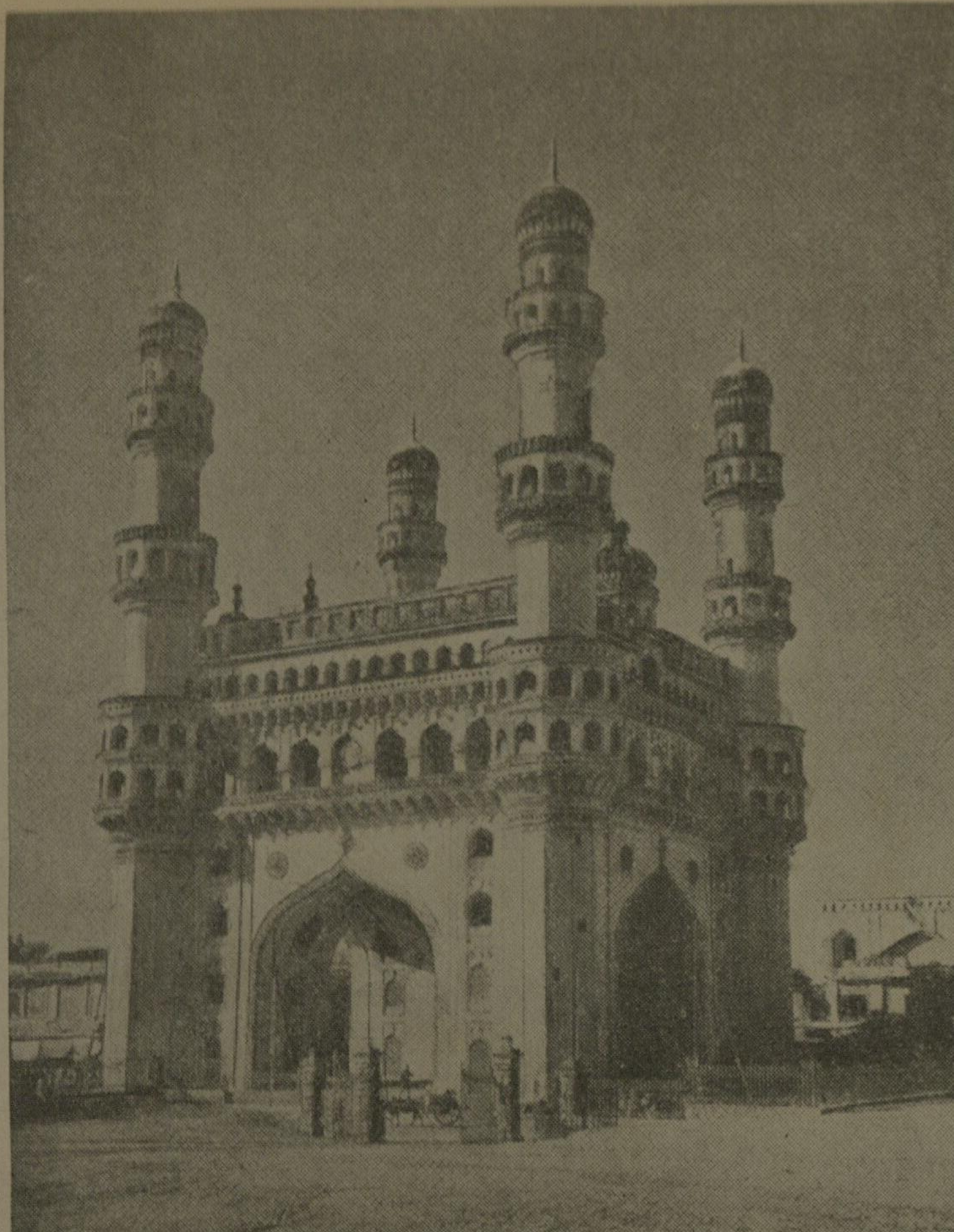
آدینہ مسجد (پانڈوہ) ۔ متعلق صفحہ ۱۸



چھوٹا سونا مسجد (غور، بنگال) ۔ متعلق صفحہ ۱۹



مدرسه محمود گاوان (بدر) - متعلق صفحه ۲۹



چار مینار (حیدرآباد) - متعلق صفحه ۳۱

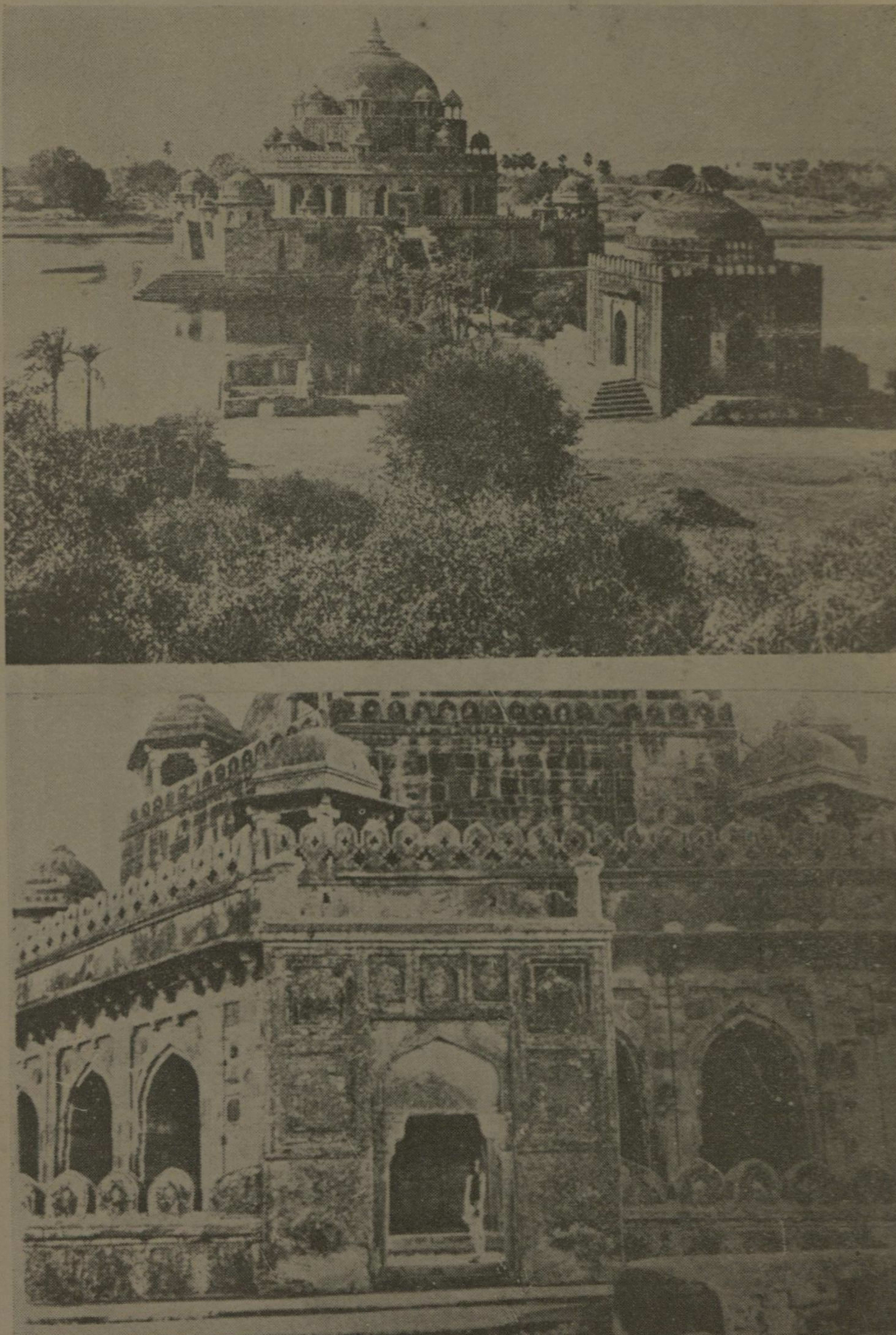
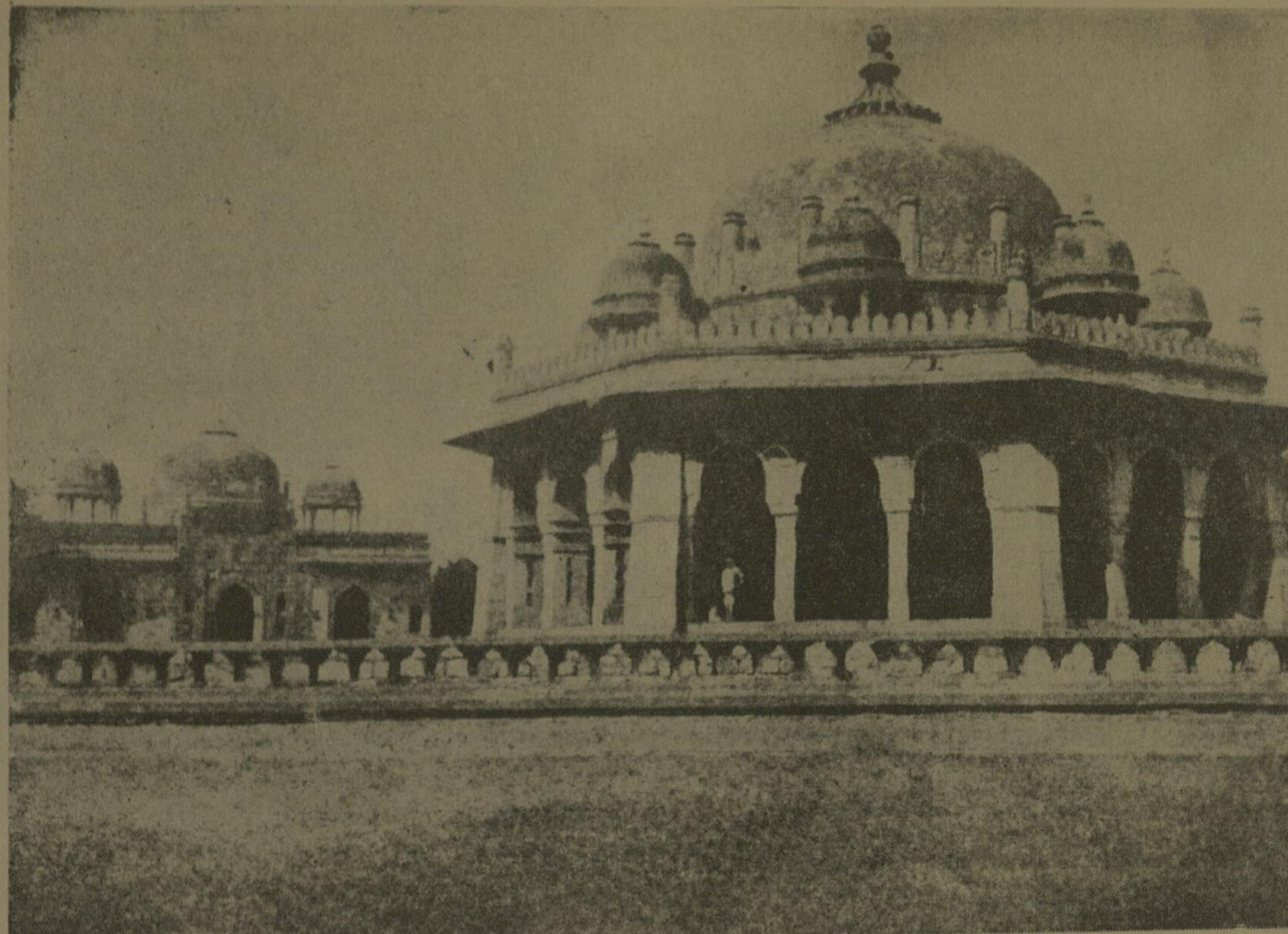
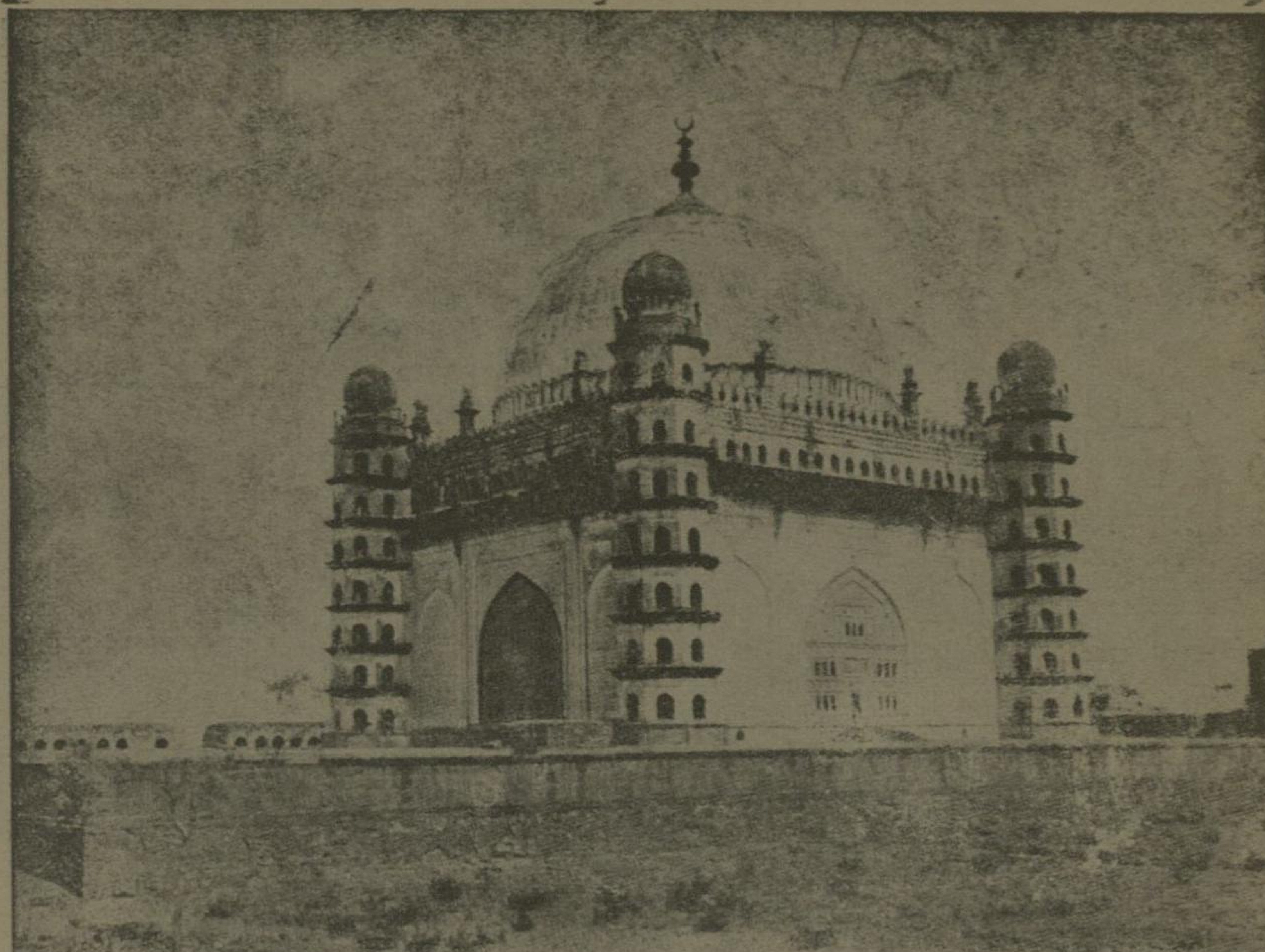


Fig. 2 Sasaram : Mausoleum of Sher Shah Sur (c. 1540)

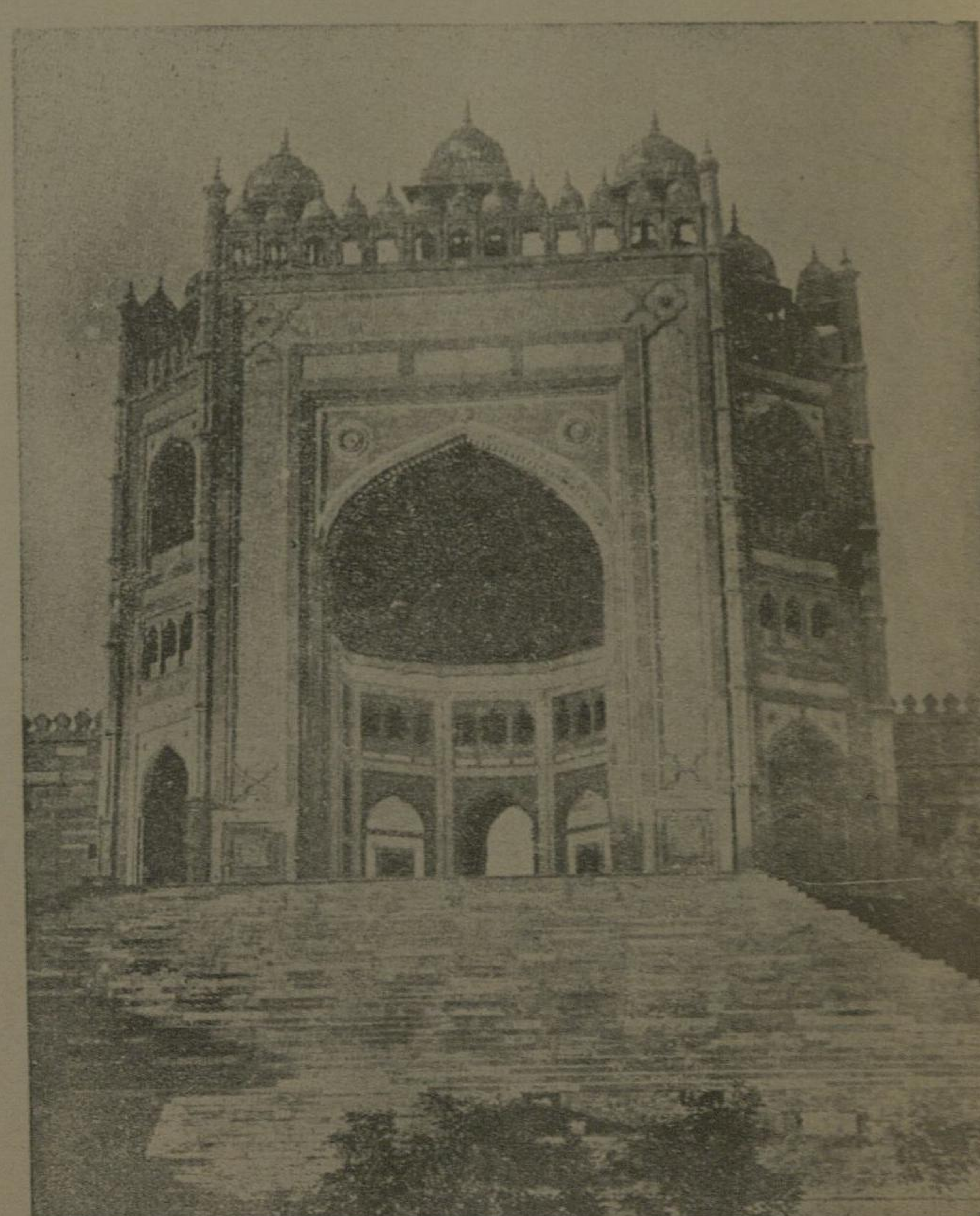
متعلق صفحہ ۳۵



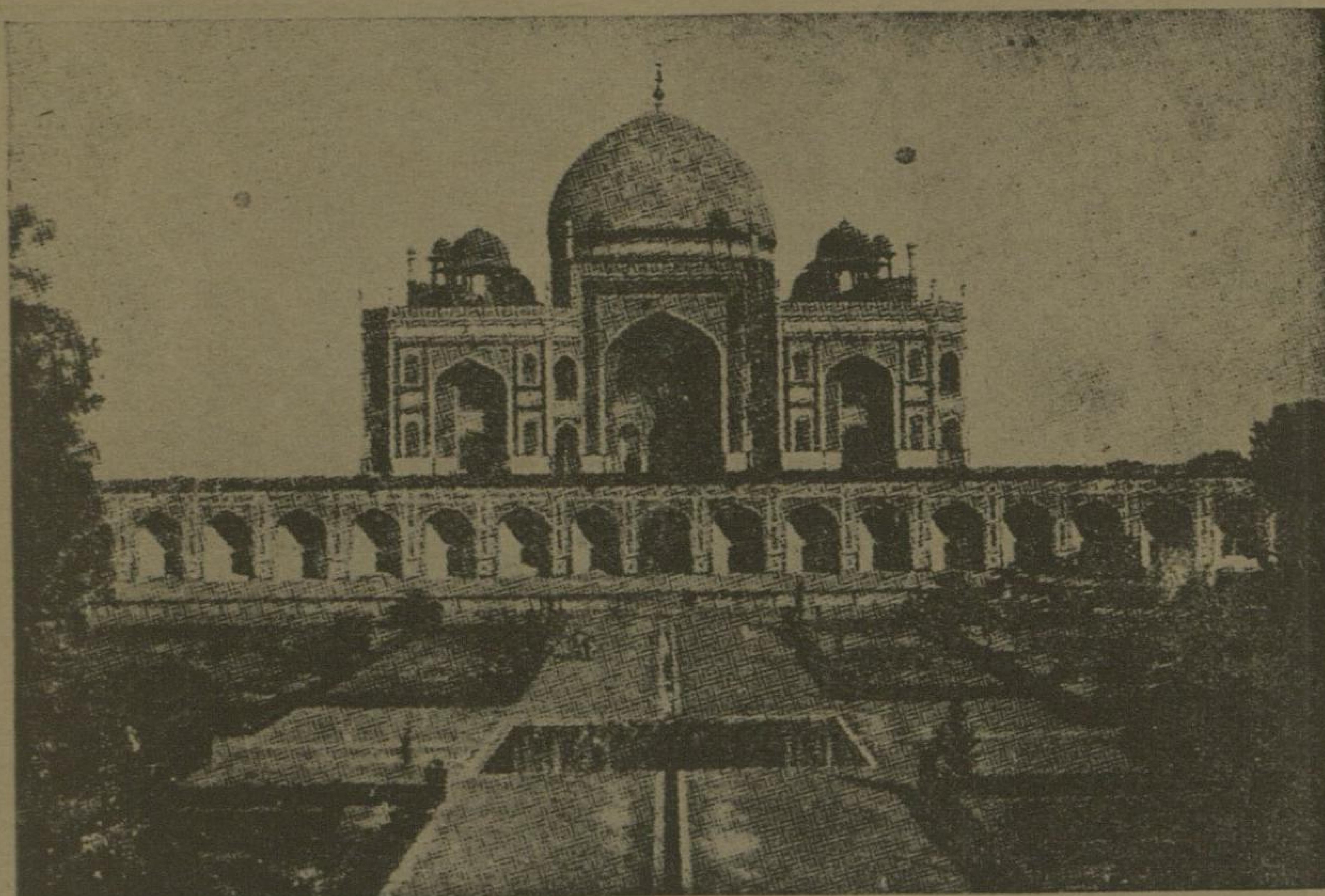
مقبرہ عیسیٰ خاں (دہلی) متعلق صفحہ ۴۰



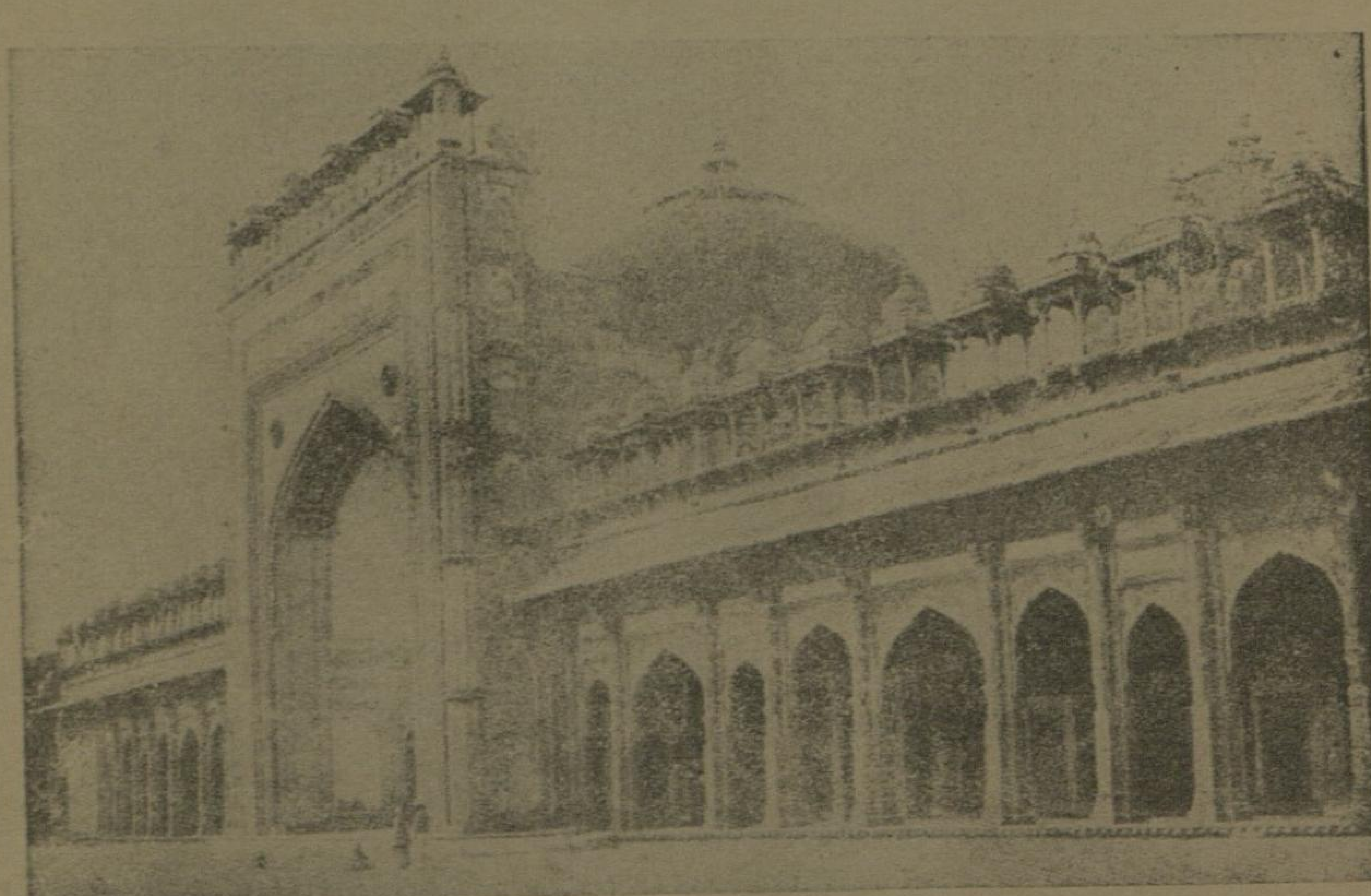
مقبرہ سلطان محمد
(بیجاپور)
متعلق صفحہ ۳۳



بلند دروازہ
فتحپور سیکری
متعلق صفحہ ۳۶



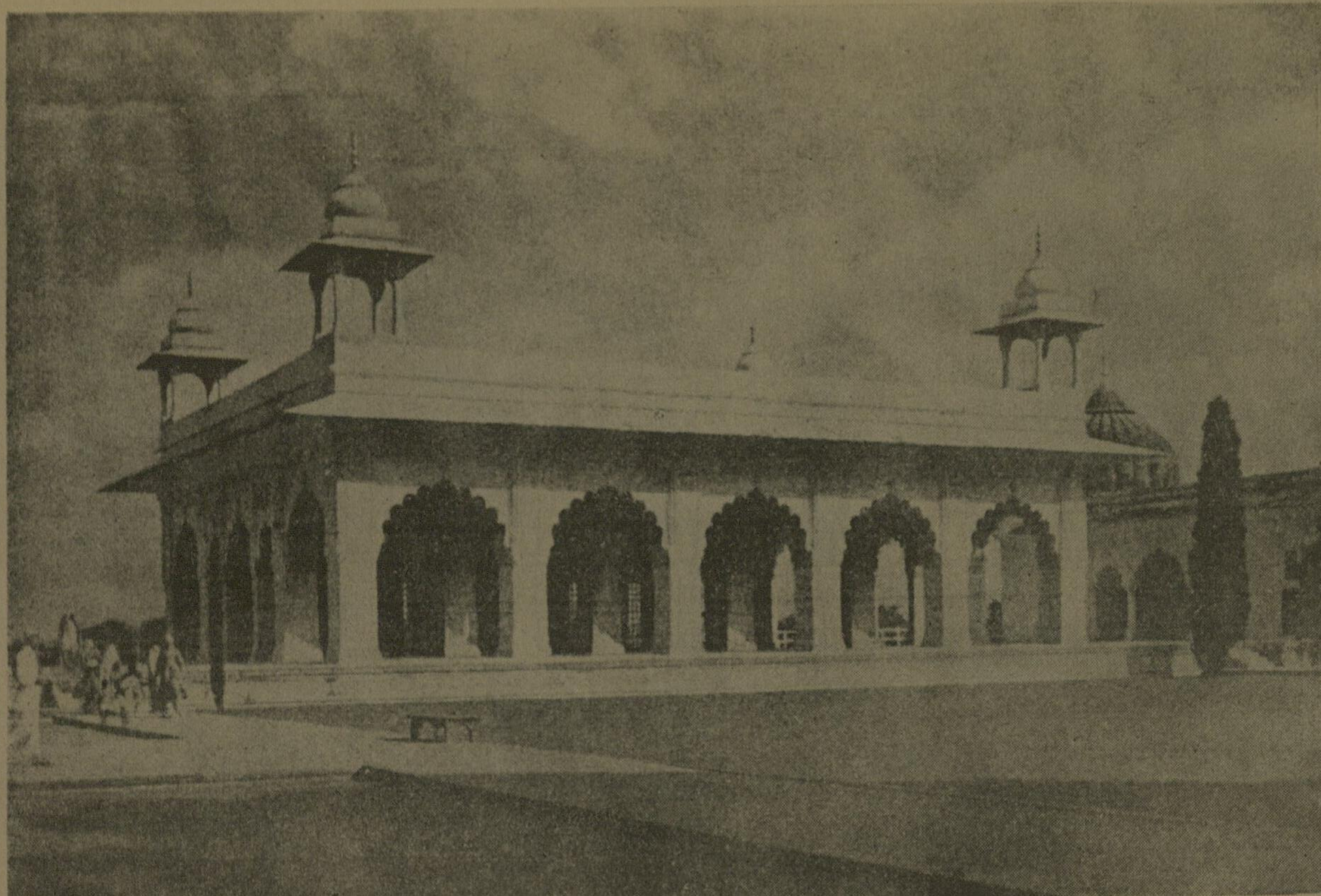
مقبرہ ہمایوں (دہلی) متعلق صفحہ ۳۲



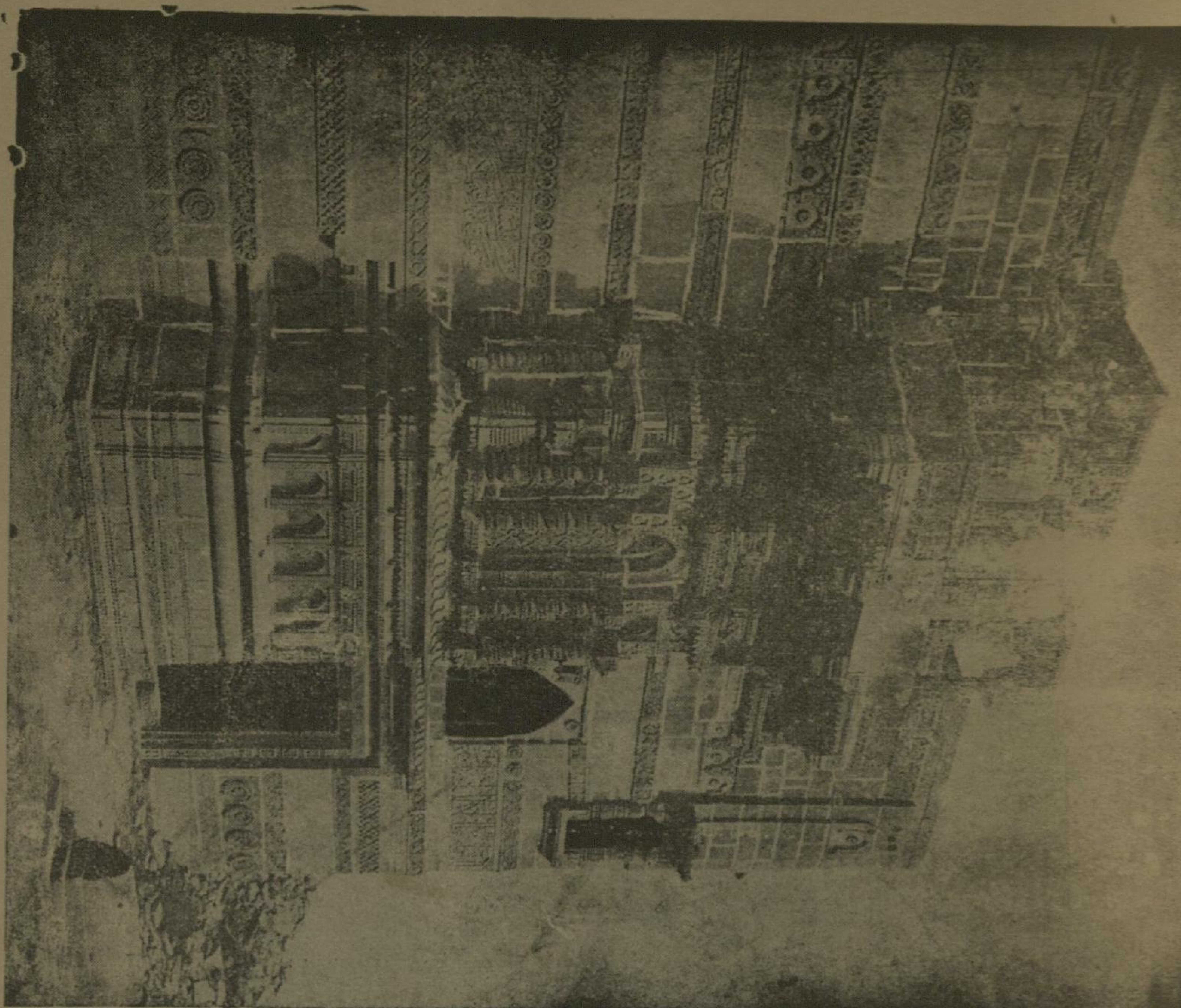
جامع مسجد فتحپور سیکری متعلق صفحہ ۳۶



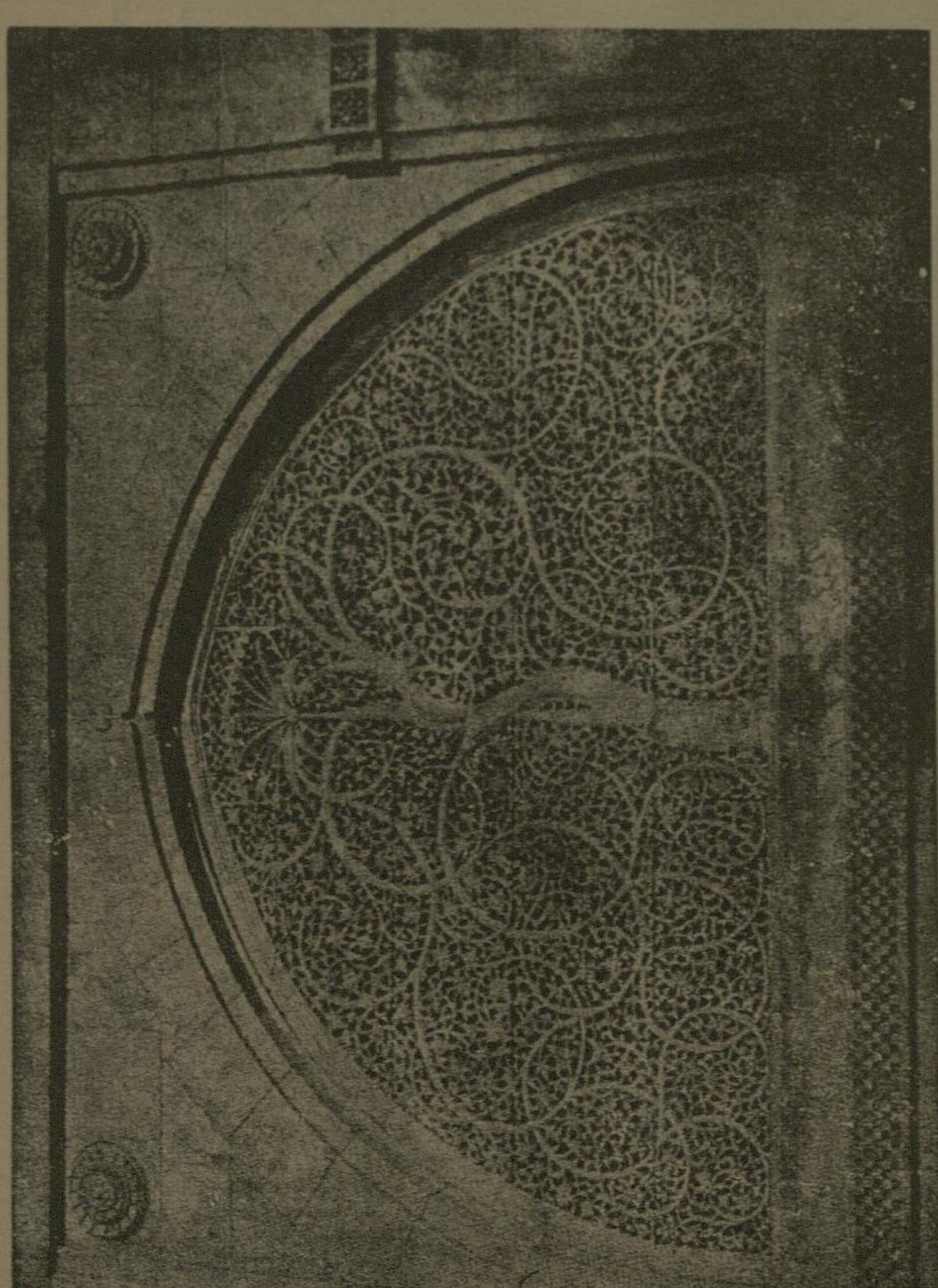
مغربی دروازه پرانا قلعه (لاهور) متعلق صفحه۳۳



دیوان خاص (قلعہ دہلی) متعلق صفحہ ۵۲



مقبرہ جام نظام الدین (ٹھٹہ)



مسجد احمد آباد میں
پتھر کی جالی
متعلق صفحہ ۲۲



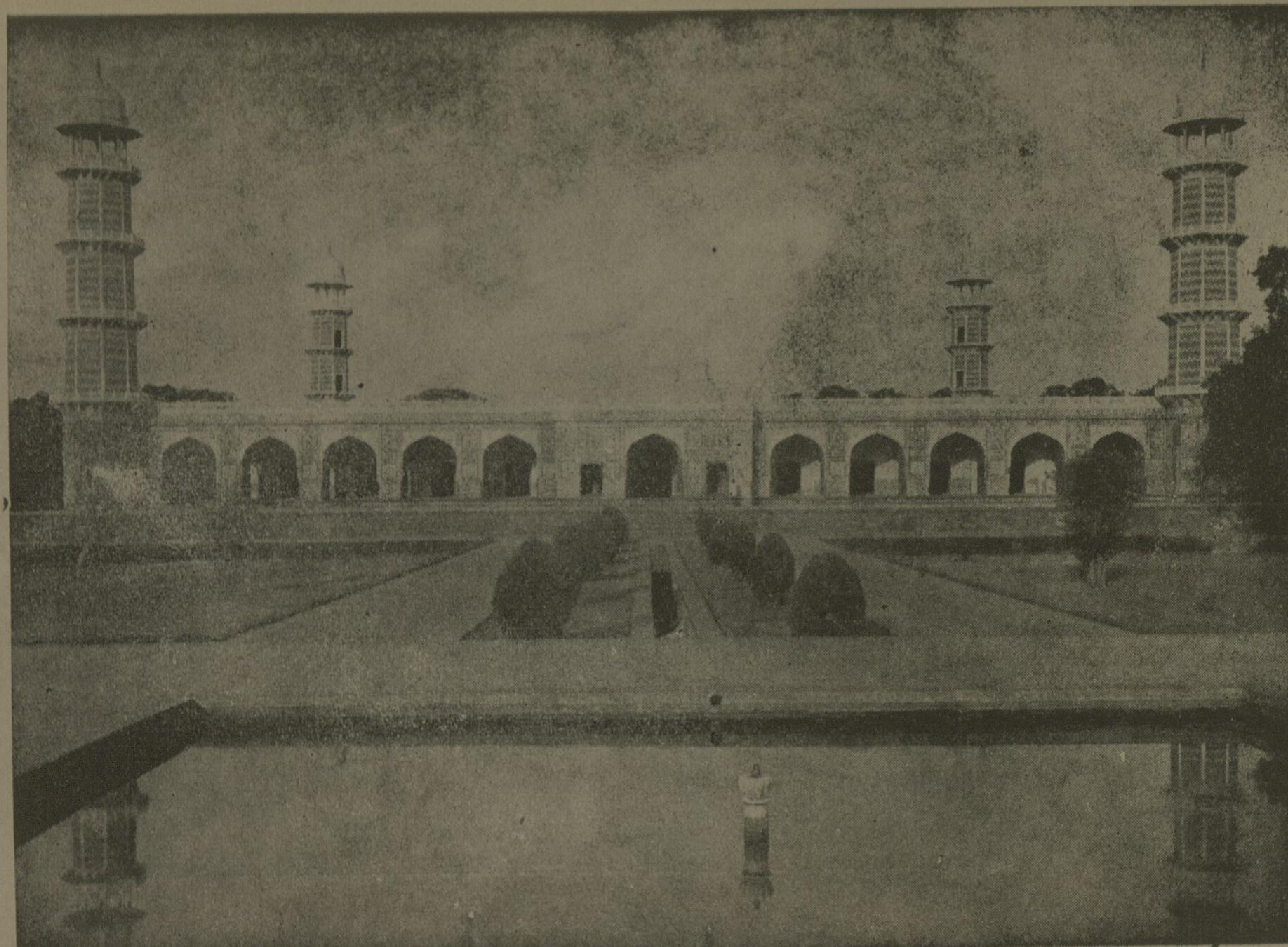
مقبرہ اعتماد الدولہ (آگرہ)

متعلق صفحہ ۴۹



وزیر خان مسجد (لاہور)

متعلق صفحہ ۵۸

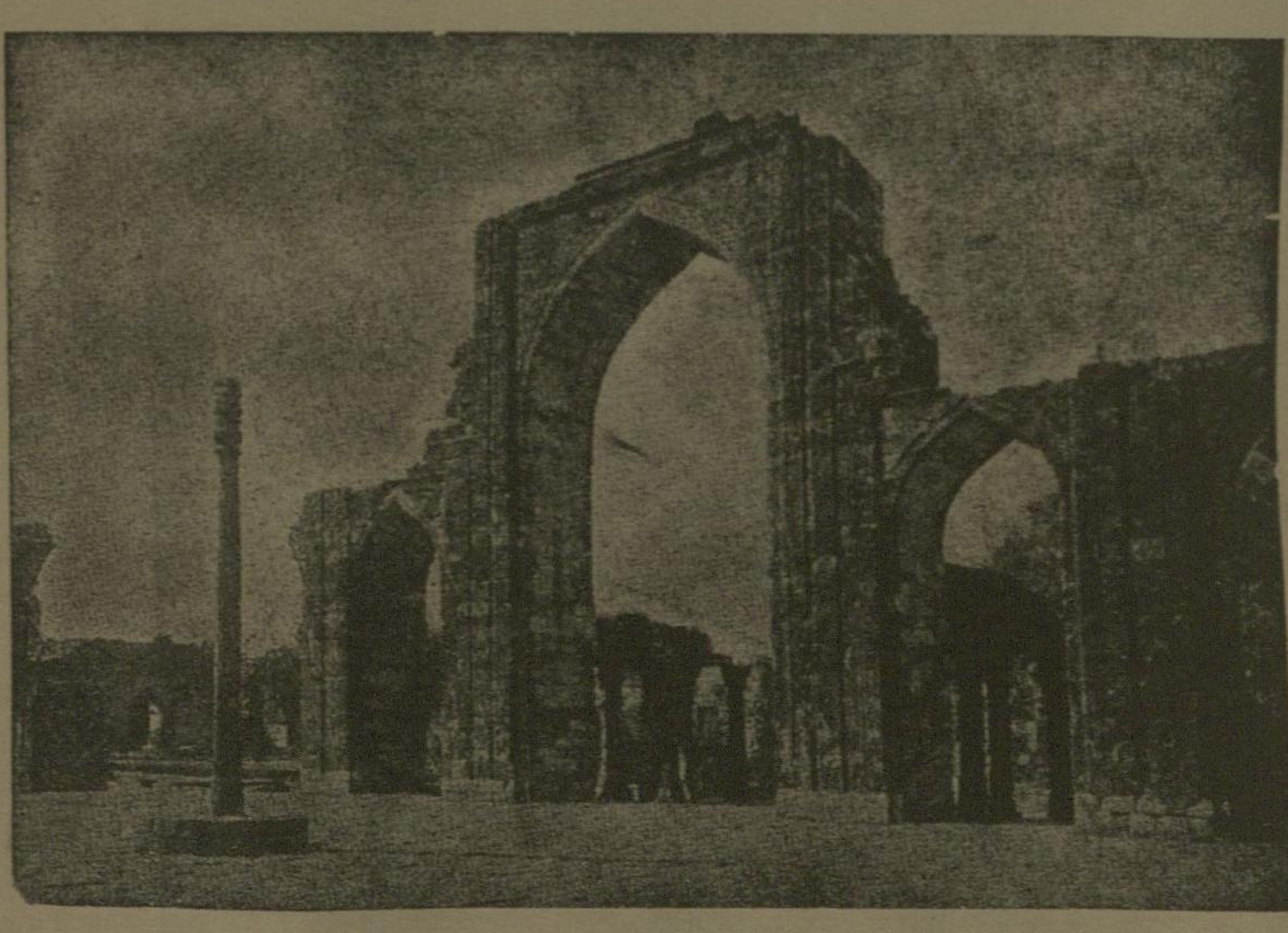


مقبره جہانگیر (لاهور)

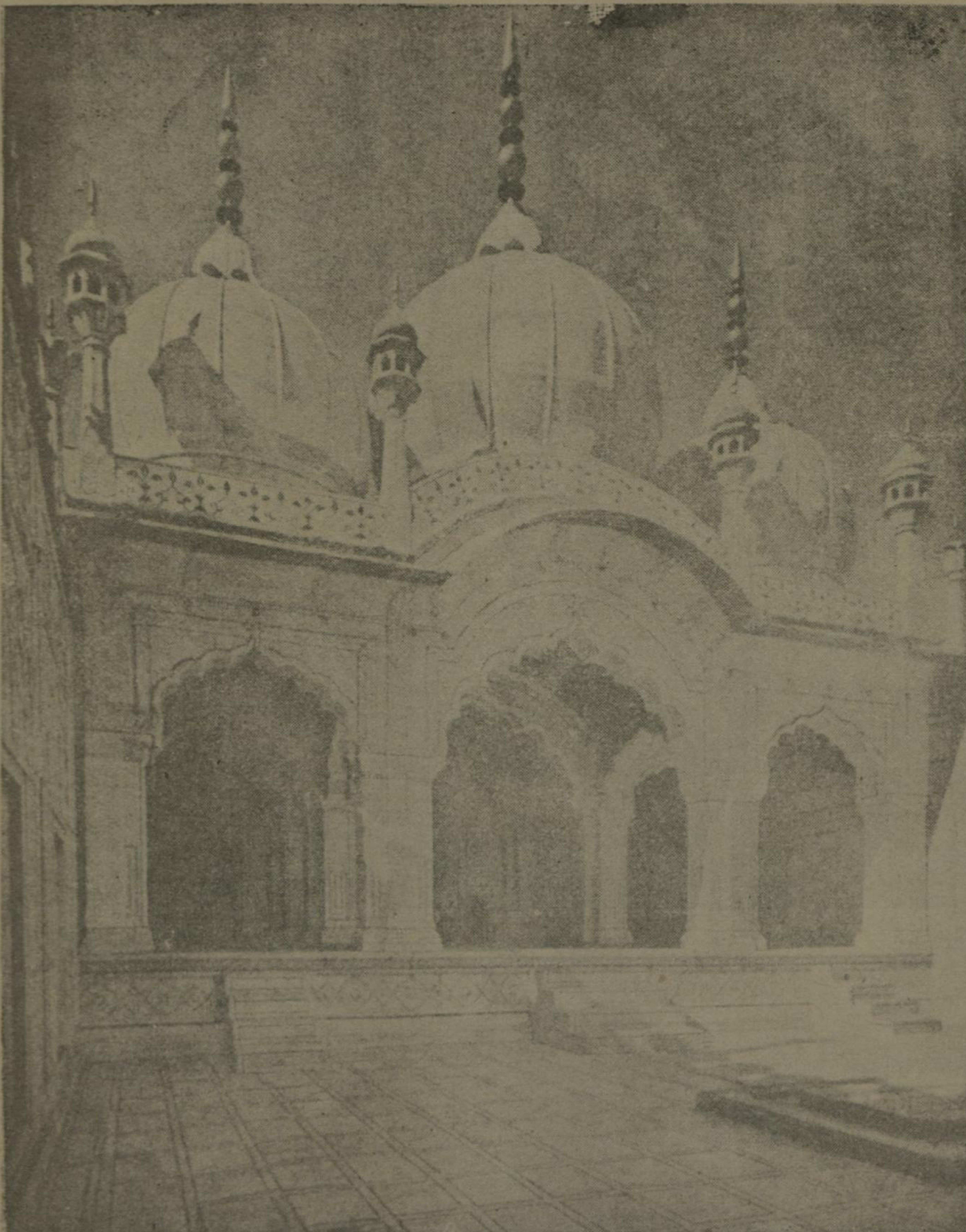
متعلق صفحه ۵۰



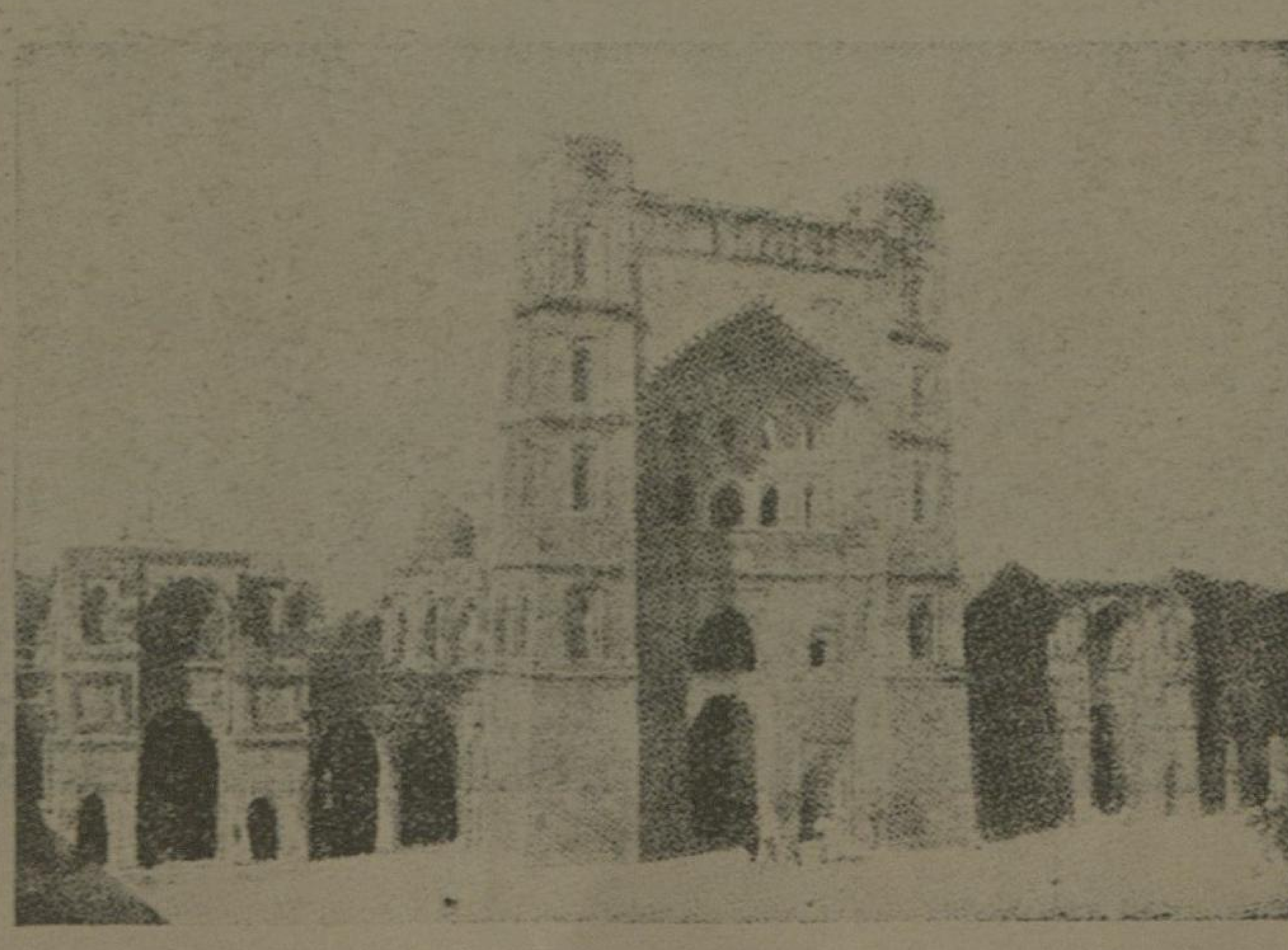
موتی مسجد کا اندرونی حصہ (قلعہ دہلی) متعلق صفحہ ٦٠



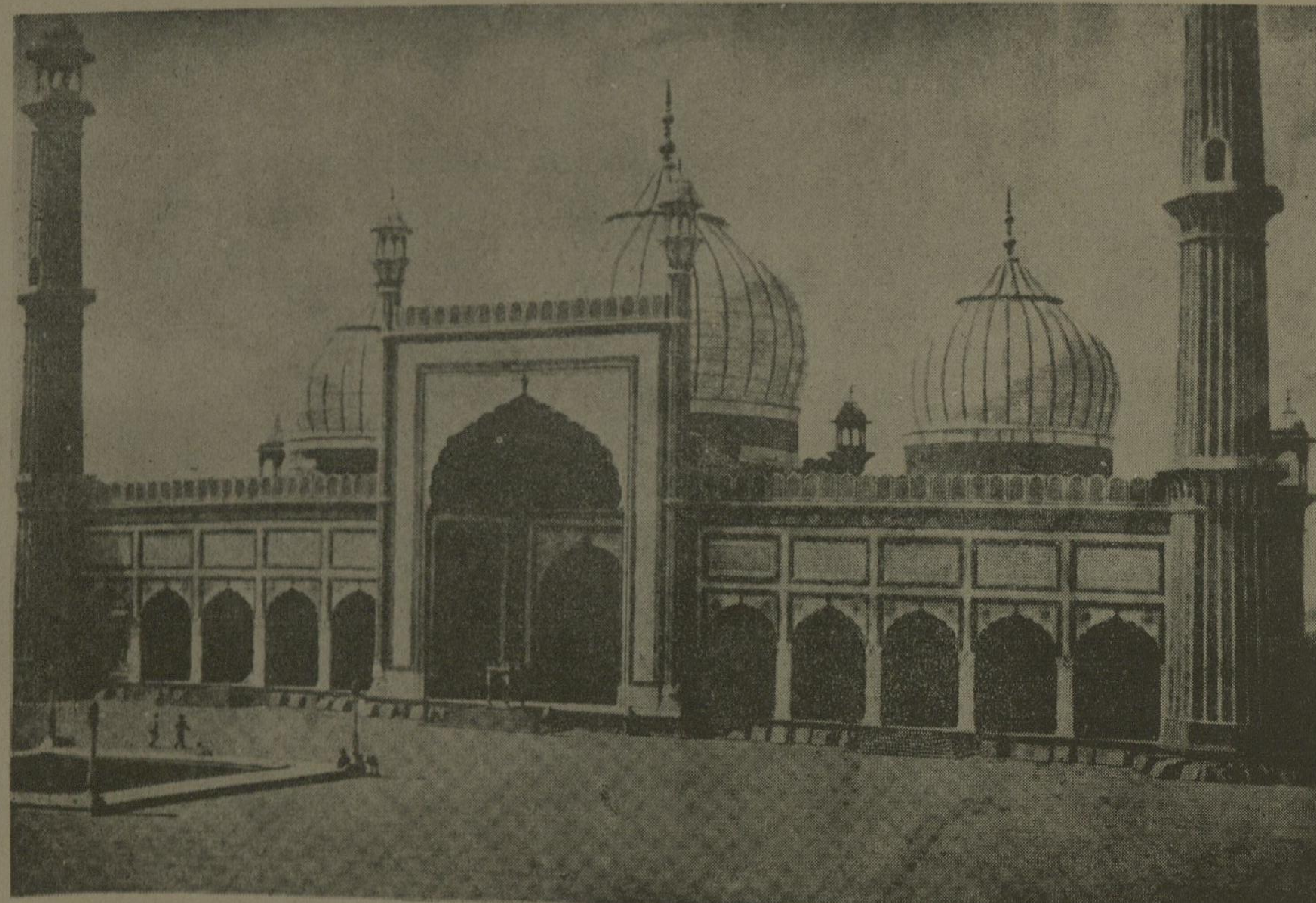
مسجد قبۃ الاسلام (دہلی)
متعلق صفحہ ٦



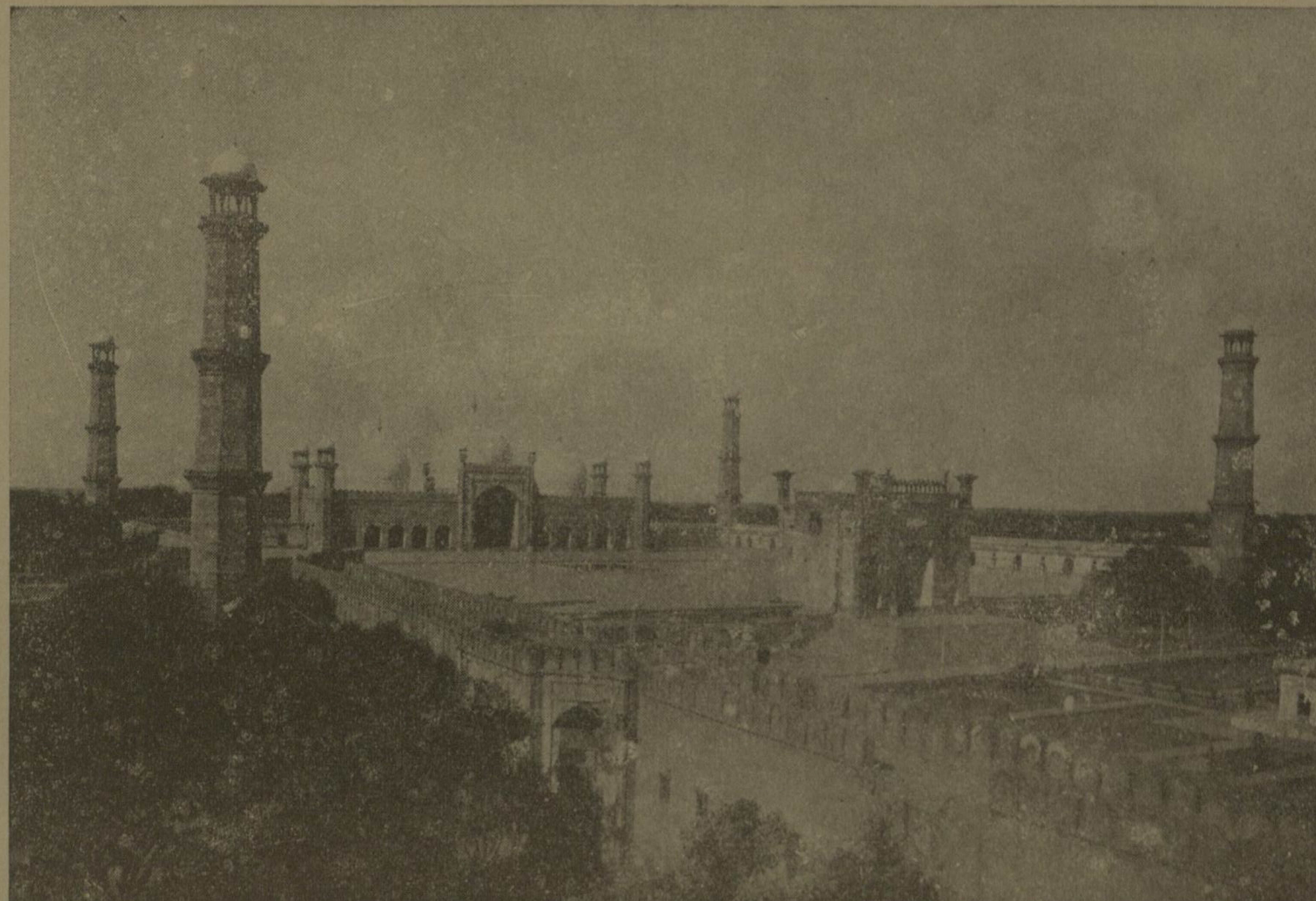
موتی مسجد (قلعہ دہلی) متعلق صفحہ ٦٠



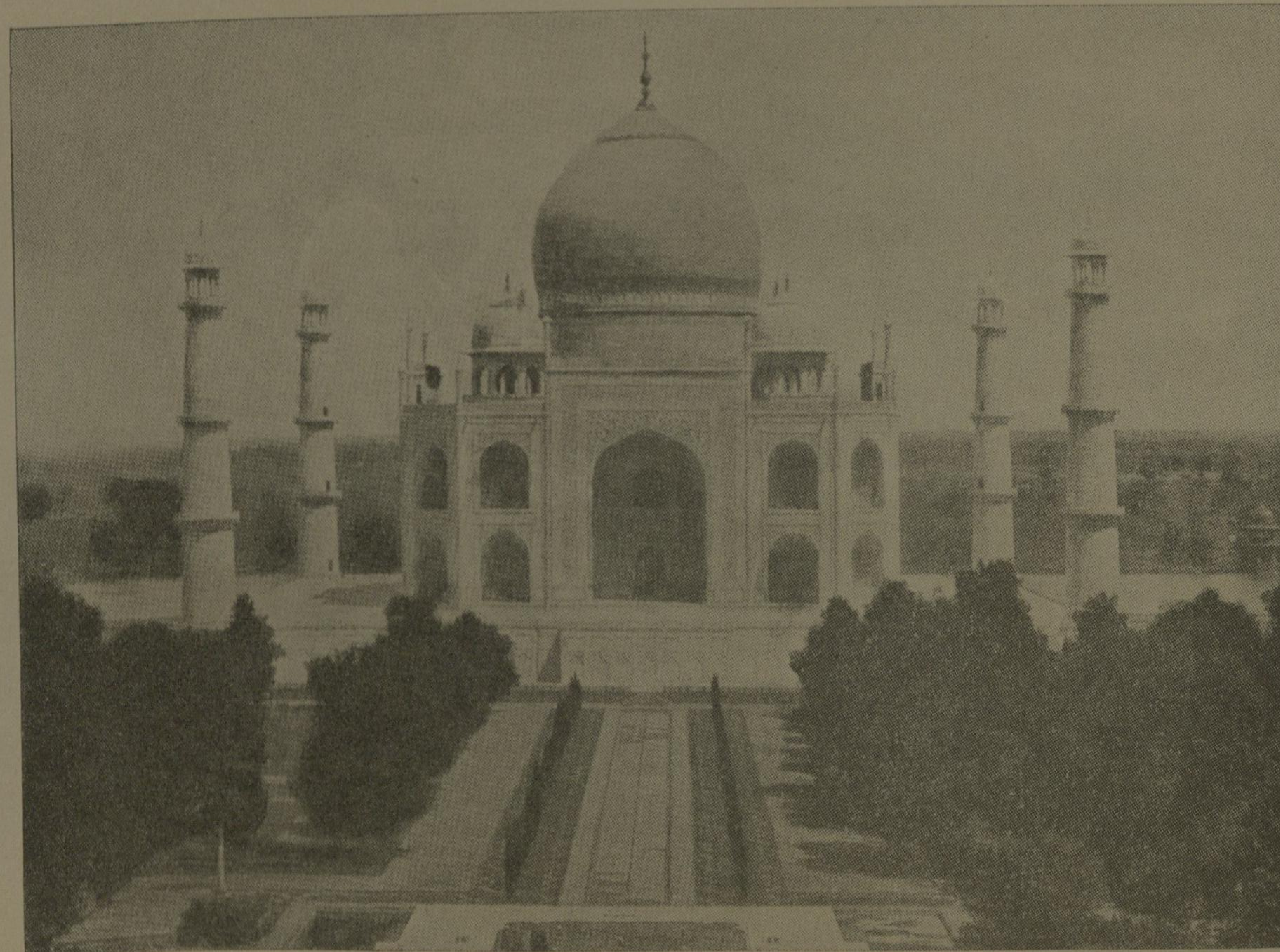
اٹالہ دروازہ
مسجد جونپور
متعلق صفحہ ۲۱



جامع مسجد دہلی متعلق صفحہ ۵۴



بادشاهی مسجد (لاهور) متعلق صفحه ٥٩



تاج محل (آگرہ) - متعلق صفحہ ٥٦